فقہ اور تصوّف
ایک تعارف
مُفتی مُحمّد رفیع عُثمانی
اِدارۃُ المعارف کراچی ۱۴

فقہ اور تصوّف

ایک تعارف

حضرت مولانا
مفتی محمد رفیع عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ - ستمبر ۱۹۹۵ء
باہتمام : محمد مُشتاق سنتی
مَطبع : احمد پرنٹنگ کارپوریشن کراچی

ناشِر : إدارۃ المعارِف کراچی ۱۴
پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰ - فون ۳۱۳۵۰۵

ملنے کے پتے
① ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴
② دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی نمبر ۱
③ ادارۂ اسلامیات، ۱۹۰ - انارکلی، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے خانقاہ تھانہ بھون میں تبلیغی و تربیتی مشاغل میں مصروفیت اور سوالات کی کثرت کے سبب اپنے آخری دور حیات میں دار الافتاء کی ذمہ داری اپنے بھانجے اور ہونہار شاگرد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی عبد الکریم گمتھلوی رحمہما اللہ کے سپرد کر دی تھی، ان دونوں حضرات کے تحریر کردہ فتاویٰ آٹھ ضخیم جلدوں میں قلمی مسودہ کی شکل میں مرتب ہوئے اور حکیم الامت قدس سرہ نے اس مسودہ کا نام "امداد الاحکام ضمیمہ امداد الفتاویٰ" تجویز فرمایا۔ مولانا شبیر علی صاحب ؒ دیگر قلمی و مطبوعہ مسودات کے ساتھ یہ مسودہ بھی قیام پاکستان کے وقت اپنے ہمراہ لے آئے تھے اور پورا علمی ذخیرہ دار العلوم کراچی کے حوالے کر دیا تھا۔

امداد الاحکام کی طباعت کا مرحلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے فقہی ترتیب کے مطابق تبویب کی ضرورت پیش آئی اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی کے زیر نگرانی کئی ایک اصحاب علم نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ خدمت انجام دی۔ اس دوران مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی مکمل

رہنمائی حاصل رہی اور آپ ہی کے ایماء و ارشاد پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیعؒ عثمانی صاحب نے فقہ کے تعارف کی غرض سے ایک مفصل تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا۔اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس تحقیقی مقالہ کو امداد الاحکام کے مقدمہ کے طور پر کتاب میں شامل کیا جاسکے گا۔جس سے امداد الاحکام کے افادہ علمی میں سہولت کے ساتھ معلومات میں بھی اضافہ ہو گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ نے اس مقالہ میں دلائل کے ساتھ اسلام کے عہد اول اور مابعد خیر القرون میں "فقہ" کے اطلاق و تحدید کا واضح فرق بیان کر کے "احسان" یعنی تصوف کو فقہ کی روح ثابت کیا ہے۔اور ان وجوہ کا ذکر کیا ہے جن کے باعث فقہ اور تصوف دو الگ اور مستقل شعبے شمار کئے جانے لگے اور دونوں کے اصول و فروع کی تعلیم و تعلم کے طریقے بظاہر مختلف رنگ میں نظر آنے لگے۔حالانکہ دونوں کا تعلق جسم اور روح کے اتحاد کا ہے۔جیسا کہ مشہور حدیث جبرئیل میں بیان کیا گیا اور حدیث من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین میں اس کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔اس حقیقت کی وضاحت کے بعد متاخرین کے نقطہ نظر کے مطابق فقہ سے مراد وہ علم ہے جس میں انسان کے ظاہری اعضاء سے کئے جانے والے ہر کام کے متعلق قرآن، سنت، اجماع یا قیاس کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ یہ جاننا کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا حرام یا مکروہ۔اس مقالہ میں شامل ادلہ شرعیہ میں سے قرآن، سنت اور اجماع کا اجمالی مگر جامع بیان امداد الاحکام میں مقدمہ کے طور پر شامل اشاعت ہو چکا ہے۔اجماع سے متعلق حصہ "فقہ میں اجماع کا مقام" کے عنوان سے ادارۃ المعارف کراچی سے رسالہ کی شکل میں پہلے سے شائع ہو رہا ہے اور موضوع کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اس پورے مقالے کو یکجا الگ کتابی صورت میں شائع کرنے کی سعادت بھی ادارۃ المعارف کراچی کو حاصل ہو رہی ہے۔ہماری خواہش ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر ادلہ شرعیہ کے چوتھے جزو "قیاس" کو بھی اپنے مخصوص انداز تحقیق کے مطابق مرتب کرنے کی طرف متوجہ ہو کر مکمل فرما دیں۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور اجر آخرت کا ذریعہ بنا دے آمین۔

والسلام
کارکنان
ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

❖ فقہ ❖

فقہ کے لغوی معنی :-

لغت میں فقہ "فہم ، سمجھداری اور ذہانت" کو کہتے ہیں ' اور فقیہ ذہین اور سمجھدار شخص کو کہا جاتا ہے [۱] اور تفقہ فقیہ [۲] ہونے ' فقہ حاصل کرنے اور اس میں غور و خوض [۳] کرنے کا نام ہے -

فقہ کے قدیم اصطلاحی معنی :-

اسلام کے قرون [۴] اولیٰ کی اصطلاح میں فقہ سے مراد " پورے دین کی گہری سمجھ " ہے ' یعنی دین کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو ان کی گہری بصیرت و مہارت کو "فقہ" کہا جاتا تھا اور فقیہ اس شخص کو کہتے تھے جو پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت رکھتا ہو ' اور اپنی پوری زندگی کو دین کے سانچہ میں ڈھال چکا ہو -

---

[۱] الصحاح للجوہری ' ص ۲۲۴۳ ج ۶
[۲] ردالمحتار ' ص ۳۸ ج ۱
[۳] الصحاح
[۴] قرون اولیٰ سے مراد عہد رسالت ﷺ اور اس کے بعد تابعین تک کا زمانہ ہے -

دینی احکام کی قسمیں :-

تفصیل اس کی یہ ہے کہ امت کو قرآن و سنت میں جو احکام دیئے گئے ان کی تین قسمیں[۱] ہیں۔

اول :- وہ احکام جن کا تعلق عقائد سے ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور توحید پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان، یوم آخرت اور اچھی بری تقدیر پر ایمان اور ہر قسم کے کفر و شرک سے اجتناب وغیرہ،

دوم :- وہ احکام جن کا تعلق بندے کے ان افعال سے ہے جو جسم کے ظاہری اعضاء، مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، حلق، زبان وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ، حج، جہاد اور نکاح و طلاق، قسم و کفارہ اور جیسے معیشت و تجارت، سیاست و حکومت، میراث و وصیت، دعویٰ اور قضا و شہادت و جرائم اور ان کی سزائیں اور جیسے سلام و کلام، کھانا پینا، سونا، اٹھنا، نشست و برخاست، مہمانی و میزبانی وغیرہ۔

سوم :- وہ احکام جن کا تعلق باطنی اخلاق و عادات سے یعنی بندے کے ان اعمال سے ہے جو وہ اپنے باطن اور قلب سے انجام دیتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اسے یاد رکھنا، دنیا سے محبت کم کرنا، اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنا، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کیلئے نیت کو خالص رکھنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا خود پسندی سے پرہیز کرنا، صبر کرنا اور غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ۔

قرآن و سنت میں ان سب قسموں کا بیان :-

چونکہ یہ تینوں قسم کے احکام دین کے لازمی اجزاء، باہم مربوط اور ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اس لئے قرآن حکیم نے ان کو الگ الگ قسموں میں بیان کرنے کی بجائے ایک ساتھ ملا جلا کر بیان کیا ہے، یہ نہیں کیا کہ ہر ایک قسم کو دوسری سے ممتاز کرنے کیلئے قرآن شریف کے الگ الگ تین حصے مقرر کر دیئے گئے ہوں، اور ہر حصہ میں صرف ایک ہی قسم کے احکام بیان کئے گئے ہوں، بہت سے مقامات پر تو ایک ہی آیت میں تینوں قسم کے احکام حسب موقع ذکر فرما دیئے گئے ہیں، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

---

[۱] خلاصہ تسہیل قصد السبیل، ص ٦ اور البحرالرائق، ص ٦ ج ١،

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

"قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے 'اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے 'اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

اس میں "ایمان" کا تعلق قسم اول سے "اچھے کام" کا تعلق قسم دوم سے "حق پر قائم رہنے" کا تعلق تینوں قسموں سے اور "صبر" کا تعلق قسم سوم سے ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں یہ تینوں قسموں کے احکام ملے جلے تھے 'جو آپ ؐ نے حسب ضرورت صحابہ کرام ؓ کو تعلیم فرمائے 'بسا اوقات ایک ہی حدیث میں کچھ احکام عقائد سے متعلق ہوتے ہیں 'کچھ ظاہری اعمال سے 'اور کچھ باطنی اخلاق و عادات یعنی اعمال قلب سے۔

دین ان تینوں قسموں کے احکام کو بجالانے کا نام ہے 'چنانچہ صحیح مسلم شریف کی سب سے پہلی حدیث میں جو "حدیث جبریل" کے نام سے معروف ہے آپ ؐ نے ان تینوں پر عمل کو "دین" قرار دیا ہے۔

پس ان میں سے کسی قسم کے احکام کو نظر انداز کر دینے سے دین مکمل نہیں ہو سکتا' اور انہی تینوں قسم کے احکام میں گہری بصیرت و مہارت کو قرون اولیٰ میں "فقہ" کہا جاتا تھا۔

فقہ امام ابو حنیفہ ؒ کے نزدیک :

اسی لئے امام ابو حنیفہ ؒ نے جو[1] تابعین کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ :-

هو معرفة النفس مالها[2] وما عليها ،

"یعنی فقہ ان امور کی بصیرت کا نام ہے جو بندے کیلئے جائز یا ناجائز ہیں"

---

[1] جامع بیان العلم لابن عبدالبر المالکی ؒ
[2] التوضیح، ص ۱۰ ج اول (مطبوعہ مصر) اور البحر الرائق ص ۶ ج ۱-

یہ تعریف علم دین کی تینوں اقسام کو شامل ہے، چنانچہ امام صاحب موصوف ؒ نے جو کتاب عقائد پر تصنیف فرمائی تھی اس کا نام "الفقہ الاکبر" رکھا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی علم عقائد فقہ ہی کا ایک اہم ترین شعبہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت کو "فقہ" کہا جاتا تھا، اور "فقیہ" اس شخص کو کہتے تھے جو پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت رکھتا ہو، اور اپنی پوری زندگی اس کے سانچہ میں ڈھال چکا ہو۔

فقیہ حضرت حسن بصری ؒ کے نزدیک :۔

مشہور تابعی اور فقیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے کہا کہ فلاں مسئلہ میں فقہاء آپ کے خلاف کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا :۔[1]

وھل رایت فقیھا بعینک ؟ انما الفقیہ الزاھد فی الدنیا الراغب فی الاخرۃ البصیر بدینہ المداوم علی عبادۃ ربہ الورع الکاف عن اعراض المسلمین العفیف عن اموالھم الناصح لجماعتھم

"تم نے آنکھ سے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو آخرت کا طلب گار ہو، اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہو، اپنے رب کی عبادت میں لگا رہے، متقی ہو، مسلمانوں کی عزت و آبرو (کو نقصان پہنچانے) سے پرہیز کرتا ہو، ان کے مال و دولت سے بے تعلق ہو، اور جماعت مسلمین کا خیر خواہ ہو۔"

معلوم ہوا کہ "فقیہ" ہونے کے لئے تمام دینی احکام کا محض علم بمعنی "دانستن" کافی نہ تھا بلکہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا بھی فقیہ کی تعریف میں شامل تھا، جس کے بغیر کوئی خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو "فقیہ" کہلانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔

احادیث میں فقہ اور فقیہ کے جو فضائل آئے ہیں وہ اسی قدیم معنی کے فقہ اور فقیہ سے متعلق ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

---

[1] رد المحتار، ص ۳۵، ج ۱، و مرقاۃ شرح مشکوۃ، ص ۲۶۷، ج ۱

"جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے
دین کا فقہ (سمجھ) عطا فرما دیتا ہے۔"

اس میں دین کے کسی شعبہ کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ علم دین کی تینوں اقسام کی فضیلت بیان کی گئی ہے، لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہ ہو گا کہ احادیث میں فقہ اور فقیہ کے فضائل صرف اسی جدید اصطلاحی معنی کے ساتھ خاص ہیں جو اب معروف ہیں، اور جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مسائل کی کثرت اور مباحث کا پھیلاؤ:۔

قرآن و سنت میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حکم الگ الگ صریح طور پر بیان نہیں کیا گیا، فروعی اور جزئی احکام وہی بیان کئے گئے ہیں جن کی عہد رسالت ﷺ میں ضرورت تھی، البتہ ایسے اصولی احکام بیان کر دیئے گئے ہیں جو قیامت تک کی ضرورت کیلئے کافی ہیں، اور ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانہ اور ہر حالت کے فروعی احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

عہد رسالت ﷺ کے بعد جب اسلام کی فتوحات دنیا میں پھیلیں، بڑے بڑے متمدن ممالک اسلام کے زیر حکومت آئے، دوسری قوموں کے بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے، مسلمانوں کو مختلف تہذیبوں سے واسطہ پڑا، نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں، اور نت نئے حالات و نظریات سامنے آئے تو ہر زمانہ کے فقہاء مجتہدین نے ان کے شرعی احکام قرآن و سنت ہی کے ابدی اصولوں سے مستنبط کئے، اور امت کو بتائے، اس طرح ہر زمانہ میں قرآن و سنت سے حاصل کئے ہوئے جزئی اور فروعی احکام میں اضافہ ہوتا رہا۔

چونکہ قرآن و سنت سے نئے مسائل کا حکم معلوم کرنے اور اس کے طریق کار میں فقہاء کا بہت سے مواقع میں اختلاف رائے بھی ہوا، جو شرعی دلائل پر مبنی ہوتا تھا، اور عقل و دیانت کی رو سے ناگزیر تھا، اس لئے ہر حکم کے شرعی دلائل کو بھی خوب خوب واضح کرنا پڑا، اس طرح تینوں قسم کے احکام و مسائل میں دلائل اور متعلقہ مباحث کا اضافہ بھی قرآن و سنت کے ہی بیان کردہ اصولوں کی بنیاد پر ہوتا رہا، اور علم دین کا نہایت قیمتی ذخیرہ جمع ہوتا گیا، جسے منضبط کرنا بعد کے لوگوں کے لئے آسان نہ تھا۔

ترتیب و تدوین:۔

اب ضرورت ہوئی کہ تمام دینی احکام کو دلائل اور متعلقہ مباحث کے ساتھ

مرتب اور مدون کر دیا جائے، تاکہ بعد کی نسلوں میں ان کی تعلیم وتدریس آسان ہو، یہ کارنامہ متاخرین یعنی تابعین کے بعد آنے والے علماء کرام نے انجام دیا۔

دینی احکام کی تقسیم تین الگ الگ فنون کی حیثیت سے :۔

ان حضرات نے سہولت پیدا کرنے کیلئے دینی احکام کی تینوں قسموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر کے الگ الگ مرتب کیا، کچھ حضرات نے صرف عقائد اور متعلقہ مباحث پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں، کچھ علماء نے صرف ظاہری اعمال کے احکام اور متعلقہ مباحث کو اپنی کتابوں میں مرتب کیا، اور کچھ بزرگوں نے باطنی اعمال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور اس کے احکام و مباحث کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا، اس طرح رفتہ رفتہ دینی احکام کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ علم و فن کی حیثیت اختیار کر گئیں، یعنی علم فقہ تین علوم میں تقسیم ہو گیا، اور ہر علم کا الگ نام رکھ دیا گیا۔

علم کلام، فقہ، تصوف :۔

عقائد اور متعلقہ تفصیلات و مباحث کے علم کا نام "علم کلام"، رکھ دیا گیا، اعمال ظاہرہ، نماز، روزہ، نکاح و طلاق، تجارت و سیاست اور معاشرت وغیرہ کے احکام و دلائل کے علم کا نام "فقہ" رکھ دیا گیا اور اعمال باطنہ، تقویٰ و توکل، اخلاص و تواضع، صبر و شکر اور زہد و قناعت وغیرہ کی بصیرت و مہارت کو "تصوف" اور "سلوک" اور "طریقت" کہا جانے لگا۔[۱]

فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف :۔

اس تقسیم میں دینی احکام کی دو قسمیں چونکہ فقہ سے الگ کر دی گئیں، لہٰذا فقہ کا موضوع اور دائرہ کار نسبتاً کافی محدود ہو گیا اسی وجہ سے متاخرین کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت سے فقہ کی تعریف بھی از سر نو کرنی پڑی، اب "فقہ" کی اصطلاحی تعریف یہ ہو گئی کہ :

"فقہ ظاہری اعمال کے متعلق تمام احکام شرعیہ کا علم ہے جو ان کے تفصیلی

---

[۱] البحرالرائق ص ۶ ج اول، والتوضیح مع التلویح ص ۱۱ ج اول (مطبوعہ مصر) و ردالمحتار، ص ۳۴ ج ۱ (نسخہ استنبول)

دلائل سے حاصل کیا جائے ؎۱۔"

جدید اصطلاح کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت جامع، مانع اور مکمل تعریف ہے، اور اب فقہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسے پوری طرح سمجھنے اور سمجھانے کیلئے فقہائے کرام نے تو اپنی عادت کے مطابق نہایت باریک بینی اور خوب تفصیل سے کام لیا ہے، کئی کئی صفحات میں اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا، یہاں اس تعریف کے اہم حصوں کی تشریح کی جاتی ہے :۔

تشریح

ظاہری اعمال :۔

سے مراد وہ اچھے یا برے کام ہیں جو بدن کے ظاہری اعضاء، مثلاً ہاتھ پاؤں، کان، ناک، حلق وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، جیسے، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، تلاوت، کھانا، پینا، سننا، سونگھنا، چھونا، پہننا، زنا، چوری وغیرہ۔

"ظاہری اعمال" کے لفظ سے فقہ کو تصوف اور علم کلام سے ممتاز کرنا مقصود ہے، کیونکہ علم کلام میں عقائد کا بیان ہوتا ہے، اور تصوف میں باطنی اعمال کا، برخلاف فقہ کے کہ اس میں صرف ظاہری اعمال کے احکام بتائے جاتے ہیں، اس میں اگر کہیں عقائد یا باطنی اعمال کا ذکر آتا بھی ہے تو ضمناً آتا ہے، اصل مقصود ظاہری اعمال کا بیان ہوتا ہے۔

احکام شرعیہ کا علم :۔

"احکام" حکم کی جمع ہے، اور "شرعیہ" شریعت کی طرف منسوب ہے، "احکام شرعیہ" ان حکام کو کہا جاتا ہے جو شریعت کی طرف منسوب یعنی شریعت سے ماخوذ ہوں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ شریعت میں انسان کے سب کاموں کی کچھ صفات مقرر کر دی گئی ہیں

؎۱ عربی میں تعریف کے الفاظ یہ ہیں: "ہو العلم بالاحکام الشرعیة العملیة المکتسب من ادلتها التفصیلیة" فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ اس تعریف کے لفظ "العملیة" میں اعمال سے مراد "ظاہری اعمال" ہیں، اسی لئے احقر نے اردو میں لفظ "ظاہری" کو صریح طور پر ذکر کیا ہے، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو التوضیح مع التلویح، ص ۱ تا ۱۹ ج ۱، اور البحر الرائق ص ۳ تا ص ۶ مع حاشیہ منحة الخالق، و تسہیل الوصول، ص ۳ تا ص ۱۰ اور رد المحتار مع الدر المختار، ص ۴ تا ص ۳۶، ج ۱۔

جو کل سات ہیں ‘فرض ‘ واجب ‘مندوب ‘ (مستحب) مباح [1] حرام ‘مکروہ تحریمی ‘مکروہ تنزیہی ‘ ان صفات کو ”احکام شرعیہ“ کہا جاتا ہے ‘انسان کے ہر کام کیلئے ان میں سے کوئی نہ کوئی حکم شرعی ضرور مقرر ہے ‘یعنی بندے کا ہر عمل شریعت کی رو سے یا فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح ‘یا حرام یا مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی ‘پس ہر اچھے برے کام کے متعلق یہ جاننا کہ اس پر شریعت نے ان میں سے کونسا حکم لگایا ہے ‘یہ ”احکام شرعیہ کا علم“ ہے ‘ مثلاً یہ جاننا کہ زکوۃ فرض ہے ‘سلام کا جواب دینا واجب ہے ‘کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا مندوب (مستحب) ہے ‘ ریل میں سفر کرنا مباح (جائز) ہے ‘چوری حرام ہے ‘ بازار میں جب عام اشیاء ضرورت کی قلت ہو تو ان کی ذخیرہ اندوزی مکروہ تحریمی ہے ‘کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے ‘ اسی طرح تمام اعمال کے متعلق ان کا الگ الگ شرعی حکم جاننا ”احکام شرعیہ کا علم“ ہے ‘ احکام اگر چہ صرف سات ہیں ‘مگر انسان کے اعمال بے شمار ہیں ‘ اور ہر عمل کے لئے ان سات میں ایک حکم مقرر ہے ‘ اس لئے اعمال کی نسبت سے شریعت کے احکام بھی بے شمار ہو جاتے ہیں۔

تفصیلی دلائل :۔

”دلائل“ دلیل کی جمع ہے ‘ یہاں احکام شرعیہ کی دلیلیں مراد ہیں ‘علم کبھی دلیل سے حاصل ہوتا ہے کبھی بغیر دلیل کے ‘ احکام شرعیہ کا علم اگر دلائل کے بغیر ہو۔ جیسے بہت سے لوگوں کو ہزار ہا شرعی احکام کا علم فقہاء سے سن کر یا ان کی کتابوں میں پڑھ کر حاصل ہو جاتا ہے ۔تو وہ فقہ نہیں ‘فقہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا گیا ہو ‘عوام کو بلکہ بہت سے علماء کو بھی ”فقیہ“ اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے یہ علم ”احکام شرعیہ کے دلائل“ سے مستنبط نہیں کیا۔

”احکام شرعیہ کے دلائل“ صرف چار ہیں ‘ (۱) قرآن ‘ (۲) سنت ‘ (۳) اجماع ‘ (۴) قیاس ‘ ہر عمل کا حکم شرعی انہی چار میں سے کسی نہ کسی دلیل سے ثابت ہوتا ہے ‘یعنی انسان کے کسی بھی عمل کے متعلق یہ بات کہ وہ فرض ہے ‘یا واجب ‘یا مندوب یا مباح ‘یا حرام یا مکروہ ‘ ثابت کرنے کا ذریعہ یا تو قرآن حکیم ہے یا سنت نبویہ ؐ یا اجماع یا قیاس ان کے علاوہ حکم شرعی ثابت یا مستنبط کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ‘ان چاروں دلائل کا تعارف آگے آئے گا۔

---

[1] مباح وہ عمل ہے جس کے کرنے میں کوئی ثواب نہیں ‘ اور ترک کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ (رفیع)

فقہ کی تعریف میں ''دلائل'' کی قید لگا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی فقیہ (مجتہد) کے علم وتقویٰ پر اعتماد کر کے اس کی تقلید کرنے والے عوام یا علماء کو جو احکام شرعیہ کا علم ہوتا ہے ان کے اس علم کو فقہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ انہوں نے یہ علم قرآن، سنت، اجماع یا قیاس سے خود مستنبط نہیں کیا، بلکہ جس امام مجتہد کی وہ تقلید کرتے ہیں اس کے بتانے سے حاصل ہوا ہے، حالانکہ فقہ شرعی احکام کے صرف اسی علم کو کہا جاتا ہے جو احکام شرعیہ کے دلائل سے حاصل کیا جائے۔

یہاں قارئین کرام کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہو گا کہ عوام کے حق میں تو یہ بات درست ہے، کیونکہ انہیں دلائل معلوم نہیں ہوتے، مگر علماء دین اگرچہ کسی امام مجتہد کی تقلید کرتے ہوں، مگر انہیں تو احکام شرعیہ کے دلائل بھی معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو فقیہ اور ان کے علم کو فقہ کہنا چاہیئے؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے جاننا اور چیز ہے، اور دلائل سے احکام شرعیہ کو معلوم کرنا یعنی مستنبط کرنا بالکل دوسری چیز، تقلید کرنے والے علماء کرام کو احکام شرعیہ کا علم دلائل کے ساتھ تو ہوتا ہے، مگر دلائل سے حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا، یعنی احکام شرعیہ کا علم تو انہیں صرف امام مجتہد کے قول سے حاصل ہو جاتا ہے، پھر وہ تحقیق کرتے ہیں کہ ان کے امام نے یہ حکم کس دلیل شرعی سے حاصل کیا ہے؟ تو احکام کے بعد دلائل کا علم بھی حاصل کر لیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ احکام شرعیہ کو خود انہوں نے قرآن وسنت یا اجماع وقیاس سے مستنبط کیا ہو، برخلاف مجتہد کے کہ وہ براہ راست ان چاروں دلائل سے احکام کو مستنبط اور معلوم کرتا ہے، یعنی وہ دلائل کو پہلے سمجھتا ہے اور پھر گہرے غور وخوض کے بعد یہ معلوم کرتا ہے کہ ان سے کیا کیا شرعی احکام ثابت ہوئے، اور عالم مقلد پہلے احکام معلوم کرتا ہے پھر دلائل کی تحقیق کرتا ہے، لہٰذا عالم مقلد کو حقیقتاً فقیہ نہیں کہہ سکتے۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فقیہ درحقیقت صرف مجتہد ہی کو کہہ سکتے ہیں، غیر مجتہد کو خواہ ہزارہا احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے معلوم ہوں تب بھی وہ فقیہ نہیں، یہ اور بات ہے کہ عرف عام میں ایسے عالم مقلد کو بھی ''فقیہ'' کہہ دیتے ہیں، مگر یہ کہنا مجازاً ہے حقیقتاً اور اصطلاحاً وہ فقیہ نہیں [۱]

تعریف میں ''دلائل'' کے ساتھ ''تفصیل'' کی قید بھی لگی ہوئی ہے، کیونکہ دلیل کی دو قسمیں ہیں، اجمالی اور تفصیلی، ''دلیل اجمالی'' مبہم اور نامکمل دلیل کو کہتے ہیں، مثلاً

---

[۱] ردالمحتار، ص ۳۵ ج اول، نسخہ استنبول، والبحر الرائق، ص ۷ ج اول۔

"نماز قائم کرنا فرض ہے"" یہ ایک حکم شرعی ہے' اس کی دلیل کے طور پر صرف اتنا معلوم کرلیا جائے کہ "یہ حکم قرآن شریف سے ثابت ہے۔"

وہ آیت اور لفظ متعین نہ کیا جائے جس سے یہ حکم ثابت ہوا ہے' نہ یہ تحقیق کی جائے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں' اور فرضیت اس سے کیونکر ثابت ہوتی' نہ یہ تحقیق کی جائے کہ فرضیت صلوٰۃ کے خلاف کوئی اور آیت یا حدیث مشہور تو موجود نہیں' ظاہر ہے کہ ایسی نامکمل اور مبہم دلیل سے کوئی حکم ثابت نہیں ہو سکتا' اور ایسی دلیل سے بالفرض کوئی علم حاصل ہو بھی تو اسے "فقہ" نہیں کہا جا سکتا۔

اور "دلیل تفصیلی" وہ ہے جس میں مذکورہ بالا تفصیل بدرجہ اتم موجود ہو' مثلاً فرضیت صلوٰۃ کی دلیل یوں بیان[1] کی جائے کہ :

"قرآن حکیم کے ارشاد "اقیموا الصلوۃ" کے معنی ہیں "نماز قائم کرو" اس میں لوگوں سے نماز قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے' اور جس کا مطالبہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہو وہ فرض ہوتا ہے' بشرطیکہ وہ مطالبہ منسوخ نہ ہوا ہو' اور فرضیت کے منافی کوئی اور آیت یا حدیث مشہور موجود نہ ہو' اور اس ارشاد قرآنی کا یہی حال ہے کہ نہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل ہے' نہ فرضیت صلوٰۃ کے منافی کوئی آیت پورے قرآن حکیم میں موجود ہے' نہ کوئی حدیث مشہور پورے ذخیرہ احادیث میں اس کے منافی موجود ہے' لہٰذا نماز قائم کرنا فرض ہے"۔

"دلائل" کے ساتھ "تفصیلی" کی قید لگا کر یہی بتانا مقصود ہے کہ ظاہری اعمال کے متعلق احکام شرعیہ کے صرف اسی علم کو "فقہ" کہا جائیگا جو احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے "اجمالی دلائل" سے اول تو علم حاصل ہوتا نہیں' اگر حاصل ہونا فرض کرلیا جائے تب بھی وہ فقہ نہیں۔

تعریف و تشریح کا حاصل :۔

فقہ کی تعریف تو مختصر تھی' تشریح میں بہت سی دقیق بحثوں کو چھوڑنے اور اختصار کی حتی الامکان کوشش کے باوجود تشریح خاصی طویل ہوگئی ہے' مجبوری یہ تھی کہ فقہ کی تعریف کو ضروری حد تک سمجھنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا' بہرحال اب فقہ کی تعریف و تشریح کا حاصل یہ نکل آیا کہ :

---

[1] تسہیل الوصول' ص ۷۔

"بندے کے ظاہری اعضاء سے ہونے والے ہر کام کے متعلق قرآن، سنت، اجماع یا قیاس کے مفصل دلائل کے ذریعہ یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے، کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا حرام یا مکروہ (تحریمی یا تنزیہی)۔"

فقہ کا موضوع:۔

کسی علم میں جس چیز کے حالات وصفات سے بحث کی جاتی ہے، وہی چیز اس علم کا موضوع ہوتی ہے، اور بحث کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان حالات وصفات کو موضوع کیلئے ثابت کیا جاتا ہے۔

علم طب میں بدن انسانی کے ان حالات سے بحث کی جاتی ہے جن کا تعلق اس کی صحت اور بیماری سے ہے، اس لحاظ سے علم طب کا موضوع انسانی بدن ہے۔

اسی طرح فقہ میں چونکہ انسان کے ظاہری افعال کی کچھ صفات (احکام شرعیہ) سے بحث کی جاتی ہے، لہٰذا فقہ کا موضوع انسان کے ظاہری افعال ہیں،[1] یعنی انسان[2] کے صرف ظاہری افعال کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے شرعی احکام کیا ہیں۔

غرض فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی رو سے نہ عقائد فقہ کا موضوع ہیں نہ باطنی اعمال و اخلاق بلکہ عقائد علم کلام کا موضوع ہیں اور باطنی اعمال و اخلاق تصوف کا، فقہ کا موضوع انسان کے صرف ظاہری افعال ہیں۔

قدیم اصطلاحی فقہ کا موضوع:۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ سب تفصیل فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی بنیاد پر ہے، جس میں عقائد اور تصوف کو فقہ سے الگ کر دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک قدیم اصطلاحی فقہ (پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت) کا تعلق ہے، اس میں نہ عقائد و اعمال کی تفریق ہے نہ ظاہر و باطن کی، عقائد ہوں یا اعمال، اعمال بھی ظاہر کے ہوں یا باطن کے، سب ہی

---

[1] ردالمحتار، ص ۳۴، ۳۵، ۳۶ ج اول (البحرالرائق ص ۷، ج اول)

[2] یہاں انسان سے صرف عاقل، بالغ مراد ہے، مجنون یا نابالغ پر چونکہ شرعی احکام کی ذمہ داریاں نہیں، لہٰذا ان کے اعمال فقہ کا موضوع نہیں، یعنی ان کے کسی فعل کو فرض، واجب یا حرام و مکروہ نہیں کہہ سکتے، اور فقہ میں جو مسائل مجنون یا نابالغ کے افعال سے متعلق ذکر کئے جاتے ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان افعال کی بناء پر اس کے ولی اور سرپرست کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

میں شریعت کے احکام کو بجالانا دین ہے ' اور ان سب کے شرعی احکام کو دلیل سے جاننا علم دین ' اسی علم دین کو قرآن و سنت میں "فقہ" اور "تفقہ فی الدین " کا نام دیا گیا ہے ' اور اس کا موضوع صرف ظاہری اعمال نہیں بلکہ عقائد اور تمام ظاہری و باطنی اعمال اس کا موضوع ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جدید اصطلاحی فقہ پورا علم دین نہیں بلکہ علم دین کا تہائی حصہ ہے ' اور یہ تہائی بھی عقائد اور تصوف کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا' جیسا کہ اگلے مباحث سے معلوم ہو گا۔

تفقہ فی الدین فرض کفایہ ہے :۔

پورا علم دین قدیم اصطلاحی فقہ ہے ' جسے قرآن حکیم نے "تفقہ فی الدین" (پورے دین کی سمجھ بوجھ) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ' اور فرض[1] کفایہ قرار دیا ہے ' ارشاد ہے۔

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ "

(توبہ : ۱۲۲)

"ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے ' تاکہ باقی ماندہ لوگ "دین کی سمجھ" حاصل کرتے رہیں"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کیلئے جس فقہ کی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ : اللھم فقھہ فی الدین ،[2]

"اے اللہ ان کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما۔"

وہ بھی یہی "تفقہ فی الدین " ہے ' جس کی وسعت دین کی تینوں شاخوں عقائد ' تصوف اور "جدید اصطلاحی فقہ" کو سمیٹے ہوئے ہے ' دور تابعین تک فقہ کا لفظ اسی وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا تھا ' بعد میں متاخرین نے محض درس و تدریس وغیرہ میں سہولت کیلئے دین کی ان تینوں شاخوں کو الگ الگ مرتب اور مدون کر کے ہر شاخ کا الگ الگ نام رکھ دیا ' جس کے نتیجہ میں ہر شاخ کی تعریف بھی الگ الگ کرنی پڑی ' چنانچہ اس مضمون میں بھی آگے لفظ "فقہ" اسی دوسرے معنی میں استعمال ہو گا ' جو متاخرین کی اصطلاح ہے۔

---

[1] تفسیر معارف القرآن ' ص ۴۸۹ ' ج ۴ '
[2] صحیح بخاری ' ص ۲۶ ج اول ' باب وضع الماء عند الخلاء ، کتاب الوضوء۔

تصوف کی حقیقت :۔

تصوف بھی چونکہ دین کا ایسا ہی اہم شعبہ ہے جیسا فقہ ' اور دونوں میں ربط اتنا گہرا ہے کہ فقہ پر عمل تصوف کے بغیر اور تصوف پر عمل فقہ کے بغیر ممکن نہیں ' جیسا کہ آگے معلوم ہو گا ' بلکہ جو فقہ قرآن و سنت کا مطلوب ہے وہ تو تصوف کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا ' اس لئے یہاں تصوف کی حقیقت کا مختصر بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ' اس کے بغیر در حقیقت فقہ کا تعارف بھی تشنہ ہی رہے گا۔

تصوف کے کئی نام ہیں ' علم القلب ' علم الاخلاق ' احسان ' سلوک اور طریقت ' یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں ' قرآن و سنت میں اس کیلئے زیادہ تر "احسان" کا لفظ استعمال ہوا ہے ' اور ہمارے زمانہ میں لفظ "تصوف" زیادہ مشہور ہوگیا ہے ' بہرحال حقیقت ان سب کی ایک ہے ' اور وہ یہ کہ ہمارے بہت سے افعال جس طرح ہمارے ظاہری اعضاء سے انجام پاتے ہیں ' اسی طرح بہت سے اعمال ہمارا قلب انجام دیتا ہے ' جن کو "اعمال باطنہ" کہا جاتا ہے ' جس طرح ہمارے ظاہری افعال شریعت کی نظر میں کچھ اچھے اور فرض و واجب ہیں ' اور کچھ ناپسندیدہ اور حرام و مکروہ '

.... اسی طرح باطنی اعمال قرآن و سنت کی نظر میں کچھ پسندیدہ اور فرض و واجب ہیں ' جیسے تقویٰ ' اللہ کی محبت ' اخلاص ' توکل ' صبر و شکر ' تواضع ' خشوع ' قناعت ' حلم ' سخاوت ' حیاء ' رحم دلی وغیرہ ' ان باطنی پسندیدہ اخلاق کو "فضائل" اور "اخلاق حمیدہ" کہا جاتا ہے ' اور کچھ باطنی اعمال برے اور حرام ہیں [۱] جیسے تکبر ' عجب ' غرور ' ریاء ' حب مال ' حب جاہ ' بخل ' بزدلی ' لالچ ' دشمنی ' حسد ' کینہ ' سنگدلی ' اور بے محل یا حد سے زیادہ غصہ وغیرہ ' ان کو "رذائل" یا اخلاق رذیلہ" کہا جاتا ہے۔

"فضائل" اور "رذائل" دونوں کا تمام تر تعلق قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے مگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے یہی قلبی احوال اور اندرونی کیفیتیں در حقیقت ہمارے تمام ظاہری افعال کی بنیاد اور اساس ہیں ' ظاہری اعضاء سے ہم اچھا یا برا جو کام بھی کرتے ہیں ' در حقیقت وہ انہی باطنی ' "فضائل یا رذائل" کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مثلاً تقویٰ (خوف خدا) اور اللہ کی محبت ' یہ قلب کی اندرونی کیفیتیں ہیں ' مگر

---

[۱] ردالمحتار مع الدرالمختار، ص ۴۰ جلد اول۔

ان کا اثر ہمارے تمام ظاہری اعمال پر پڑتا ہے ' ہماری ہر عبادت نماز روزہ وغیرہ انہی دو باطنی اخلاق کی پیداوار ہے ' ہم نفسانی اور شیطانی تقاضوں کے باوجود اگر بدنظری ' لڑائی جھگڑے اور جھوٹ ' وغیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں ' تو اس اجتناب کا اصل محرک بھی یہی تقویٰ اور اللہ کی محبت ہے۔

اسی طرح ظاہری اعضاء سے ہم جو گناہ بھی کرتے ہیں اس کا سبب بھی کوئی نہ کوئی باطنی خصلت ہوتی ہے ' مثلاً مال کی محبت یا جاہ پسندی یا عداوت یا حسد یا غصہ یا آرام طلبی یا تکبر وغیرہ۔

تمام ظاہری اعمال کا حسن و قبح اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مقبول یا مردود ہونا بھی ہمارے باطنی اخلاق پر موقوف ہے ' مثلاً اخلاص و ریا یہ قلب ہی کے متضاد اعمال ہیں ' مگر ہمارے تمام ظاہری اعمال کا حسن و قبح ان سے وابستہ ہے ' کوئی بھی عبادت نماز ' حج وغیرہ جو محض ریاء کے طور پر دنیا کی شہرت حاصل کرنے کیلئے کی جائے عبادت نہیں رہتی ' اور تجارت و مزدوری جو اپنی اصل کے اعتبار سے دنیاداری کا کام ہے مگر حکم خداوندی کی تعمیل میں اللہ کی رضا کی نیت سے کی جائے تو یہی تجارت و مزدوری باعث اجر و ثواب اور عبادت بن جاتی ہے ' یہ ریا اور اخلاص ہی کا کرشمہ ہے جس نے عبادت کو دنیا داری اور دنیاداری کو اللہ کی عبادت بنا دیا ہے ' یہی مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ :-

انما الاعمال بالنیات [۱]

"تمام اعمال کا ثواب نیتوں پر موقوف ہے۔"

تقریباً یہی حال تمام باطنی "فضائل و رذائل" کا ہے کہ ہمارے ظاہری اعمال کے حسن و قبح ' رد و قبول اور اجر و ثواب ' بلکہ بہت سے اعمال کا وجود بھی انہی کا رہین منت ہے ' یہی وہ حقیقت ہے جس کی نشاندہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں فرمائی [۲] ہے کہ :-

الا ان فی الجسد مضغة ، اذا صلحت صلح الجسد کله ،
و اذا فسدت فسد الجسد کله ، الا وهی القلب ،

"ہوشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ جب

---

[۱] یہ مشکوۃ شریف کی سب سے پہلی حدیث ہے۔
[۲] صحیح بخاری ' کتاب الایمان "باب من استبراء لدینه ، و صحیح مسلم باب اخذ الحلال و ترک الشبهات ،

وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے' اور وہ خراب ہو
تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے' ہوشیار رہو کہ وہ دل ہے ۔"

اسی لئے تمام علماء و فقہاء کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ "رذائل" سے بچنا اور "فضائل" کو حاصل کرنا ہر عاقل' بالغ پر فرض ہے [15] یہی فریضہ ہے جس کو اصلاح نفس' یا تزکیہ نفس اور تزکیہ اخلاق یا تہذیب اخلاق" کہا جاتا ہے' اور یہی تصوف کا حاصل [16] و مقصود ہے ۔

دل کی پاکی' روح کی صفائی اور نفس کی طہارت ہر مذہب کی جان اور نبوتوں کا مقصود رہا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو چار مقاصد قرآن حکیم میں بتائے گئے ان میں دوسرا یہ ہے کہ :۔

وَيُزَكِّيهِمْ (بقرہ' آل عمران' جمعہ)

"آپ مسلمانوں (کے اخلاق و اعمال) کا تزکیہ فرماتے ہیں"

قرآن نے ہر انسان کی کامیابی و نامرادی کا مدار بھی اسی تزکیہ نفس پر رکھا ہے ۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس : ۹' ۱۰)

"یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا
وہ جس نے اسے (رذائل میں) دھنسا دیا ۔"

اور بتایا کہ گناہ ظاہری اعضاء ہی سے نہیں ہوتے بلکہ باطن کے بھی گناہ ہیں' دونوں سے بچنا فرض عین ہے' اور ہر گناہ موجب عذاب خواہ ظاہر کا ہو یا باطن کا' ارشاد ربانی ہے :۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ
سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (انعام : ۱۲۰)

"تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی' بلاشبہ جو
لوگ گناہ (ظاہر کا یا باطن کا) کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے
کی سزا عنقریب ملے گی"

---

[15] رد المحتار مع الدر المختار' ص ۴۰ ج اول'
[16] تصوف کے مشہور امام حضرت عبدالقاہر سہروردی " نے اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں تصوف کی جو حقیقت تفصیل سے بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے' دیکھئے "عوارف المعارف" ص ۲۹۰ ج اول برحاشیہ احیاء العلوم للغزالی "۔

باطنی گناہ قلب کے وہی گناہ ہیں جن کے متعلق پیچھے عرض کیا گیا ہے کہ وہ ہماری تمام ظاہری گناہوں کا منبع ہیں، ہمارے ہر گناہ کا سوتا وہیں سے پھوٹتا ہے، تصوف کی اصطلاح میں انہی کو "رذائل یا اخلاق رذیلہ" کہا جاتا ہے، ان کے بالمقابل دل کی نیکیاں اور عبادتیں ہیں جو ہماری تمام ظاہری عبادتوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہیں، ہر عبادت اور ہر نیکی انہی کی مرہون منت ہے، قلب کے ان نیک اعمال کو تصوف کی اصطلاح میں "فضائل یا اخلاق حمیدہ" کہا جاتا ہے۔

جس طرح اچھے برے ظاہری اعمال کی ایک طویل فہرست ہے جن کے شرعی احکام فقہ میں بتائے جاتے ہیں، اسی طرح باطنی اعمال یعنی "رذائل اور فضائل" کی تعداد بھی بہت ہے جو تصوف کا موضوع ہیں، یہاں چند فضائل اور چند رذائل بطور مثال ذکر کئے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہو گا کہ قرآن و سنت نے فضائل کی تاکید اور رذائل کی ممانعت کتنے شد و مد سے کی ہے، اور یہ تاکید کسی طرح اس تاکید سے کم نہیں جو ظاہری اعمال کی اصلاح کے لئے قرآن و سنت میں کی گئی ہے۔

فضائل :-

ایک باطنی عمل "تقویٰ" ہے، قرآن حکیم نے اپنی دوسری ہی سورۃ میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں، ارشاد ہے:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ، (بقرہ : ۲)

"یہ کتاب (قرآن) تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔"

تقویٰ والوں کیلئے آخرت کی لازوال نعمتوں کی جگہ جگہ بشارت ہے، مثلاً

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِي جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ، (طور : ۱۷)

"بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے"

قرآن نے جا بجا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ سچے لوگوں کی معیت و صحبت اختیار کرو:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ

(توبہ : ۱۱۹)

"اے ایمان والو: اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ یعنی ایسے لوگوں کے ساتھ رہو جو نیت اور بات میں سچے ہیں"

اللہ کے نزدیک ہر عزت و برتری کا معیار بھی یہی تقویٰ ہے، ارشاد ہے :۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ، (حجرات : ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو۔"

یہ چند آیات محض بطور نمونہ ہیں، سب آیات جمع کی جائیں تو کئی ورق درکار ہوں گے۔

اسی طرح "اخلاص" دل کا عمل ہے، قرآن حکیم نے اس کی تاکید میں بھی کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ :۔

فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ (زمر:۱۱)

قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ، (زمر:۱۱)

"سو آپؐ اللہ کی عبادت کیجئے، اسی کیلئے عبادت کو خالص کرتے ہوئے۔"

"آپؐ کہہ دیجئے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھوں" [1]

قرآن پاک میں سات جگہ یہ ارشاد ہے :۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ،

"اطاعت گزاری کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے۔"

اسی طرح "توکل" جو نفس کا اندرونی عمل ہے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا اور ساتھ ہی بشارت سنائی گئی کہ :۔

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ، (ال عمران :۱۵۹)

"تو آپ، اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے۔"

سب مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ :۔

عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران :۱۲۲)

---

[1] تفسیر معارف القرآن، ص ۵۴۴ ج ۷۔

"پس مسلمان تو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھیں۔"

قرآن پاک نے بتایا کہ پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی امتوں کو توکل کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا کہ :-

یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ، (یونس : ۸۴)

"اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اصول کا اعلان عام فرما دیا ہے کہ :-

مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ، (طلاق : ۳)

"جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔"

اسی طرح "صبر" باطنی فضائل میں سے ہے، جس کے معنی ہیں "طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنے پر نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور ثابت قدم رکھنا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اس صبر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، قرآن حکیم میں آپ کو ہدایت کی گئی کہ :-

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف : ۳۵)

"تو آپؐ (ویسا ہی) صبر کیجئے جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا تھا۔"

مسلمانوں کو بتایا گیا کہ :-

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ، (نحل : ۱۲۶)

"صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے"

اور حکم کے ساتھ بشارت دی گئی کہ :-

وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ، (انفال : ۴۶)

"اور صبر کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

جنت کی نعمت عظمیٰ بھی صبر کرنے والوں ہی کا حصہ ہے، ارشاد ہے :-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ، (ال عمران : ۱۴۲)

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہوگے ؟ حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کو (آزماکر) نہیں دیکھا، جنہوں نے خوب جہاد کیا ہو اور جو صبر کرنے والے ہوں"

یہ صرف چار فضائل کے متعلق آیات قرآنیہ کی چند مثالیں ہیں، تمام آیات و احادیث جمع کی جائیں تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے، ان مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے کہ شرعی فرائض صرف ظاہری اعمال میں منحصر نہیں، فضائل کا حاصل کرنا بھی نماز، روزہ وغیرہ کی طرح فرض ہے، بلکہ خود نماز روزہ وغیرہ بھی ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔

رذائل

رذائل وہ ناپاک باطنی اخلاق و اعمال ہیں جن کو قرآن و سنت میں حرام قرار دیا گیا ہے، ان کی بھی یہاں فہرست دینا نہ ممکن ہے نہ مقصود، چند مثالیں یہ ہیں :

تکبر کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ، بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اور جسے اللہ پسند نہ کرے اس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہاں ہوگا؟ چنانچہ ارشاد ہے :

اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ ، (زمر:٦٠)

"کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے ؟"

شافع محشر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ :

لایدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر[۱]

"جس شخص کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

ریاء، ایسا خطرناک باطنی رذیلہ ہے کہ وہ انسان کی بہتر سے بہتر عبادت کو تباہ کرتا بلکہ الٹا

---

[۱] مسلم شریف، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ ص ٦٥ ج ۱

عذاب میں گرفتار کرا کے چھوڑتا ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ، (ماعون)

"بڑا عذاب ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کو "چھوٹی قسم کا شرک" قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:-

ان اخوف ما اخاف عليكم الشرك الاصغر، قالوا: وما الشرك الاصغر يا رسول الله! قال الرياء يقول الله عز وجل يوم القيامة: اذا اجازى العباد باعمالهم، اذهبوا الى الذين كنتم تراءون في الدنيا، فانظروا اهل تجدون عندهم الجزاء (مسند احمد، طبرانی، بیهقی، شعب الایمان)

"تمہارے متعلق جن چیزوں کا مجھے ڈر ہے ان میں سب سے زیادہ خوفناک "چھوٹا شرک" ہے، صحابہؓ نے دریافت کیا "چھوٹا شرک" کیا ہے یارسول اللہؐ؟ آپؐ نے فرمایا 'ریاء' قیامت کے دن جب اللہ عزوجل اپنے بندوں کو ان کے کاموں کا ثواب عطا فرمائے گا تو دکھاوے کے لئے کام کرنیوالوں سے فرما دے گا کہ "جاؤ ان لوگوں پاس جاؤ جنہیں دکھانے کیلئے تم دنیا میں کام کرتے تھے، اور دیکھو ان سے تمہیں ثواب ملتا ہے یا نہیں۔"[1]

حسد، وہ باطنی بیماری ہے کہ اس کا بیمار دنیا میں تو چین پاتا ہی نہیں، اس کی آخرت بھی برباد ہو کر رہتی ہے، قرآن پاک کے بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا اور سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین پر کیا گیا،[2] کیونکہ آسمان پر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، اور زمین پر سب سے پہلا قتل جو

---

[1] حافظ زین الدین عراقیؒ نے شرح احیاء العلوم میں کہا ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں، دیکھئے احیاء العلوم مع شرح، ص ۲۵۴، ج ۳۔

[2] احیاء العلوم، ص ج ۳ و تفسیر معارف القرآن، ص ۸۴۵ ج ۸ بحوالہ تفسیر قرطبی۔

قابیل نے ہابیل کا کیا تھا وہ بھی اسی حسد کا شاخسانہ تھا۔
حاسد کا شر اتنا خطرناک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی کہ آپ اس کے شر سے پناہ مانگیں :۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (الفلق: ۵)
"اور (آپ کہئے کہ میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ :[۱]

ایاکم و الحسد، فان الحسد یا کل الحسنات کما یا کل النار الحطب
"تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ...... (برباد کر دیتا) ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے ۔"

اسی طرح بخل باطن کی وہ رذیل خصلت ہے جو انسان کو ہر مالی ایثار و قربانی سے روکتی ہے، اس باطنی بیماری کا ذکر قرآن حکیم نے ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو کافروں کا خاصہ ہیں، ارشاد ہے :۔

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰى ، (اللیل: ۸ تا ۱۱)
"اور جس نے بخل کیا، اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، ہم اس کو رفتہ رفتہ سختی میں پہنچا دیں گے، اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا، جب وہ (جہنم) کے گڑھے میں گرے گا۔"

جس شخص کا بخل اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ شریعت نے جو مالی واجبات اس کے ذمہ کئے ہیں ان کی ادائیگی سے بھی محروم ہو جائے، اس کیلئے قرآن حکیم میں سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے :

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
"جو لوگ ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو

---

[۱] ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، ص ۶۷۲ ج ۲، اصح المطابع۔

اپنے فضل سے دی ہے وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ یہ بات ان
کے لئے کچھ اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کیلئے بہت ہی بری ہے،
ان لوگوں کو قیامت کے دن اس مال کا (سانپ بناکر) طوق
پہنایا جائے گا، جس میں انہوں نے بخل کیا تھا،،

بخل کا بیمار دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہردلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے، اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (محمدؐ: ۳۸)
،،پس تم میں سے بعض وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور جو بخل
کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔،،

بخل ہی کے بدترین درجہ کا نام ،،شح،، ہے، قرآن پاک نے بتایا کہ فلاح و کامیابی انہی لوگوں کا مقدر ہے جو شح سے محفوظ ہوں:-

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ، (حشر:۹)
،،اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو وہی
لوگ فلاح پانے والے ہیں۔،،

تصوف اور علم تصوف کی اصطلاحی تعریف:-

غرض ،،فضائل،، اور ،،رذائل،، کی ایک طویل فہرست ہے، تمام باطنی خصلتوں کا الگ الگ بیان، ہرایک کی حقیقت و ماہیت، اس کے اسباب و علامات، فضائل حاصل کرنے کے طریقے اور رذائل سے چھٹکارا پانے کی تدابیر، یہ تفصیلات تو تصوف کی کتابوں[1] اور صوفیاء کرام کی مجلسوں میں ملیں گی، یہاں ان مثالوں سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے، کہ جس طرح ظاہر کے کچھ اعمال فرض عین اور کچھ حرام ہیں اسی طرح باطن کے اعمال میں بھی کچھ فرض عین ہیں، اور کچھ حرام، اور ان باطنی فرائض پر عمل کرنا اور باطن کی حرام خصلتوں سے اجتناب کرنا ہی تصوف ہے، چنانچہ علم تصوف کی اصطلاحی تعریف جو امام

---

[1] مثلاً امام غزالی ؒ کی ،،احیاء العلوم جلد ثالث،، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ کی ،،التشرف،، اور ،،تعلیم الدین،، اور ،،روح تصوف،، و ،،قصد السبیل،، وغیرہ۔

غزالی رحمہ اللہ نے تفصیل سے بیان کی ہے' اس کا جامع مانع خلاصہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ :- [2]

هو علم يعرف به انواع الفضائل وكيفيه اكتسابها ، وانواع الرذائل وكيفية اجتنابها ،

"تصوف وہ علم ہے جس سے اخلاق حمیدہ کی قسمیں اور ان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اخلاق رذیلہ کی قسمیں اور ان سے بچنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے ۔"

فقہ کی طرح علم تصوف کا بھی ایک حصہ فرض عین اور پورا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے :-

(جس طرح ہر مرد و عورت پر اپنے اپنے حالات و مشاغل کی حد تک ان کے فقہی مسائل جاننا فرض ہے اور پورے فقہ کے مسائل میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا اور مفتی بننا سب پر فرض نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے [3] اسی طرح جو اخلاق حمیدہ کسی میں موجود نہیں انہیں حاصل کرنا اور جو رذائل اس کے نفس میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بچنا' تصوف کے جتنے علم پر موقوف ہے اس کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور پورے علم تصوف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا کہ دوسروں کی تربیت بھی کر سکے' یہ فرض کفایہ ہے ۔[4]

---

[1] دیکھئے احیاء العلوم' ص ۱۹' ج اول (مطبوعہ مصر)۔

[2] رد المحتار' مع الدر المختار' ص ۴۰ ج اول۔

[3] فرض کی دو قسمیں ہیں' فرض عین اور فرض کفایہ' فرض عین اس فرض کو کہا جاتا ہے جس کا ادا کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر ضروری ہے' بعض مسلمانوں کے کرلینے سے باقی مسلمان سبکدوش نہیں ہوتے' جیسے نماز' روزہ' حج' زکوۃ وغیرہ' اور فرض کفایہ وہ فرض ہے جو بعض لوگوں کے بقدر ضرورت ادا کرنے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے' جیسے مسلمان میت کے کفن دفن کا انتظام' نماز جنازہ اور جہاد وغیرہ' پورے فقہ اور پورے علم تصوف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا بھی فرض کفایہ ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو وہاں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شرعی مسائل بتا سکے' اور ان کے تزکیہ اخلاق کا کام بقدر ضرورت کرسکے تو اس بستی کے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے' اور اگر اس شہر میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگوں پر فرض ہے کہ ایسا عالم اپنے یہاں تیار کریں یا کہیں اور سے بلا کر رکھیں' ورنہ سب اہل شہر گنہگار ہوں گے (تفسیر معارف القرآن: ص ۴۸۷ تا ۴۹۰ ج ۴)۔

[4] رد المحتار مع الدر المختار' ص ۴۰ ج اول' و تفسیر معارف القرآن سورۃ توبہ آیت ۱۲۲ ص ۴۹۰ ج ۴۔

صوفی و مرشد :-

جس طرح فقہ کے ماہر کو "فقیہ"، "مفتی" اور "مجتہد" کہتے ہیں اسی طرح تصوف و سلوک کے ماہر کو "صوفی"، "شیخ"، "مرشد" اور عام زبان میں "پیر" کہا جاتا ہے، جس طرح قرآن و سنت سے فقہی مسائل و احکام نکالنا اور حسب حال شرعی حکم معلوم کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں، بلکہ رہنمائی کیلئے استاذ یا "فقیہ اور مفتی" کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اسی طرح باطنی اخلاق کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنا ایک نازک اور قدرے مشکل کام ہے، جس میں بسا اوقات مجاہدوں، ریاضتوں اور طرح طرح کے نفسیاتی علاجوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کسی ماہر کی رہنمائی کے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا، اس نفسیاتی علاج اور رہنمائی کا فریضہ شیخ و مرشد انجام دیتا ہے۔

اسی لئے ہر عاقل و بالغ مرد و عورت کو اپنے تزکیہ اخلاق کیلئے ایسے شیخ و مرشد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو قرآن و سنت کا متبع ہو، اور باطنی اخلاق کی تربیت کسی مستند شیخ کی صحبت میں رہ کر حاصل کر چکا ہو[1]

بیعت سنت ہے فرض و واجب نہیں :-

بیعت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مرشد اور اس کے شاگرد (مرید) کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، مرشد یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا سکھائے گا، اور مرید وعدہ کرتا ہے کہ مرشد جو بتلائے گا اس پر عمل ضرور کریگا، یہ بیعت فرض و واجب تو نہیں، اس کے بغیر بھی مرشد کی رہنمائی میں اصلاح نفس کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے، لیکن بیعت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت ہے اور معاہدہ کی وجہ سے فریقین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی قوی رہتا ہے، اس لئے بیعت سے اس مقصد کے حصول میں بہت برکت اور آسانی ہو جاتی ہے۔

کشف و کرامات مقصود نہیں :-

جب اصلاح نفس کا مقصد ضروری حد تک حاصل ہو جاتا ہے، یعنی اپنے ظاہری اور باطنی اعمال قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی زندگی کے ہر گوشہ میں ہونے لگتی ہے، تو ایسے بعض لوگوں پر بعض حالات میں کشف و الہام اور کرامات کا ظہور بھی ہو جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے، جیسا کہ متعدد صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کے واقعات معروف ہیں، مگر یہ کشف و کرامات نہ

---

[1] شیخ میں کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اس کیلئے ملاحظہ فرمائیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رسالہ "قصد السبیل" ہدایت سوم ص ۵۔

فقہ کا مقصود ہیں نہ تصوف کا، نہ ان پر دین کا کمال موقوف ہے نہ علم دین کا بلکہ بعض پوشیدہ یا آئندہ پیش آنے والی باتیں معلوم ہو جانا یا عجیب و غریب واقعات کا پیش آجانا تو کمال دین کی دلیل بھی نہیں، کیونکہ اس قسم کی چیزیں تو مشق کرنے سے بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی پیش آجاتی ہیں جو دین کے پابند نہ ہوں، مسمریزم اور جادو کرنے والوں کی شعبدہ بازیاں بھی دیکھنے میں تو عجیب و غریب ہی ہوتی ہیں، مگر ان کیلئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ کشف و کرامات شعبدہ بازی نہیں ہوتی، بلکہ محض اللہ جل شانہ، کا عطیہ جو وہ اپنے کسی نیک بندے کو بعض حالات میں دیدیتا ہے، مگر یہ تصوف کا مقصود نہیں اور دین کا کوئی کمال اس پر موقوف نہیں۔

مقصود صرف اتباع شریعت اور اللہ کی رضا ہے :۔

دین کا کمال تو اپنے ظاہر و باطن میں شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے میں ہے، اسی سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور یہی فقہ اور تصوف کا حاصل و مقصود ہے، یہ مقصود نہ فقہ پر عمل کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے نہ تصوف کے بغیر، تصوف کا مقصود نہ بیعت ہے نہ ریاضتیں اور مجاہدے ہیں، اور نہ کشف و کرامات، بیعت اور مجاہدے مقصود حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، اور کشف و کرامات مقصود حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف سے ایک قسم کا مزید انعام ہیں، کسی کو یہ انعام ملتا ہے، کسی کو کسی اور انعام سے نواز دیا جاتا ہے، بالفرض جسے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بغیر ہی اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح نصیب ہو جائے اور زندگی بھر ایک بار بھی سچا خواب نظر نہ آئے، نہ کسی کشف و کرامت کا ظہور ہو اس کے بھی ولی اللہ اور مومن کامل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس سے کشف و کرامت کا ظہور ہوتا ہو وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ کامل و افضل ہو، مدار کمال و افضلیت تو صرف اور صرف تقوی پر ہے، جس میں زیادہ تقویٰ ہے وہی زیادہ افضل اور اللہ عزوجل کا زیادہ مقرب ہے، قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ :۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ، (حجرات : ۱۳)
"اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔"

تصوف کی حقیقت جو ان صفحات میں بیان کی گئی، تصوف کی تمام مستند کتابیں اسی اجمال کی تفصیل ہیں، تمام فقہاء اور صوفیاء کرام اس کی تعلیم و تربیت کرتے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اسی تصوف اور اسی فقہ پر عمل کا کامل نمونہ ہے، اور یہی ایمان کے بعد قرآن وسنت کی تعلیمات کا حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں افراط و تفریط اور گمراہیاں :۔

فقہ اور تصوف کی جو حقیقت پچھلے صفحات میں بیان ہوئی اور ان میں جو گہرا ربط قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا گیا یہ اتنا صاف اور واضح ہے کہ امت کے تمام مفسرین و محدثین اور تمام صوفیاء و عارفین کا اس پر اجماع و اتفاق چلا آرہا ہے، جس نے قرآن و سنت یا فقہ و تصوف کا مطالعہ کیا ہو اس کیلئے اس میں کسی شبہ یا تردد کی گنجائش نہیں۔

مگر نہ جانے کیوں فقہ اور تصوف کے سلسلہ میں مسلمانوں کا خاصا بڑا طبقہ افراط و تفریط بلکہ طرح طرح کی گمراہیوں کا شکار ہو گیا' ان لوگوں نے فقہ اور تصوف کو سمجھے بغیر ان کے بارے میں عجیب و غریب مزعومات قائم کر لئے، جنہیں صرف فقہ کی کتابیں ہاتھ لگیں، مگر نہ علماء صلحاء کی تعلیم و تربیت ملی، نہ تصوف کی مستند کتابوں تک رسائی ہوئی، بلکہ جاہل مدعیان تصوف کی خود ساختہ غلط روش دیکھ کر اس کو تصوف سمجھ بیٹھے، انہوں نے دین اور احکام دین کو صرف فقہ میں منحصر جان کر سرے سے تصوف ہی سے بیزاری اختیار کر لی، اور تصوف کو دین سے خارج بلکہ الحاد و زندقہ قرار دے لیا' یہ ایک شدید گمراہی ہے جو خاصے بڑے طبقہ میں پائی جاتی ہے۔

ایک اور گمراہی اس سے کم درجہ کی مگر اس لحاظ سے نہایت تشویشناک ہے کہ وہ علم دین کے بعض طلبہ بلکہ بعض نام نہاد اہل علم میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے تصوف کو دین سے خارج تو نہیں سمجھا مگر نہ جانے کیوں یہ خیال کر بیٹھے کہ اس کا حاصل کرنا محض مباح یا مستحب ہے، شرعاً فرض و واجب نہیں، اصلاح باطن بھی ہو گئی تو جنت میں درجات بڑھ جائیں گے، نہ ہوئی تو جنت میں جانے کیلئے ظاہری اعمال کافی ہیں۔

دوسری طرف جاہل مدعیان تصوف کی گرم بازاری ہے، جنہوں نے تصوف و طریقت کی اہمیت کو تو تسلیم کیا مگر اس کی حقیقت کو گم کر ڈالا، کسی نے کہا "طریقت اور ہے شریعت اور، فلاں بات اگرچہ شرع میں ناجائز ہے مگر فقیری میں جائز ہے" ان لوگوں نے تصوف کو "راز سینہ بسینہ" قرار دے کر اس من گھڑت "راز" کی بنیاد پر دین کے کتنے ہی حرام کاموں کو حلال کر ڈالا، اور دین و تصوف کے نام پر الحاد و بے دینی کا شکار ہو گئے۔

کسی نے تعویذ گنڈوں کا اور کسی نے مریدوں سے نذرانے وصول کرنے کا نام تصوف رکھ لیا، کسی نے پیر صاحب سے بیعت ہونے ہی کو جنت کا پروانہ سمجھا، اور اصلاح نفس و اعمال سے غافل ہو کر مطمئن ہو گئے، کہ "پیر صاحب بخشش کرا دیں گے" کسی نے دل کی خاص قسم کی دھڑکنوں کو اور کسی نے "غیب کی باتیں" بتلانے کو تصوف کا کمال سمجھ لیا، کسی نے صرف تسبیحات و وظائف اور نوافل کو تصوف و طریقت کا نام دے لیا، اور

ظاہر و باطن کی اصلاح سے بے فکر ہو کر کتنے ہی فرائض اور حقوق العباد کو پامال کر ڈالا کسی نے مجاہدوں، ریاضتوں، چلہ کشی، رہبانیت اور ترک دنیا کو طریقت و سلوک کی معراج قرار دے کر بال بچوں، ماں باپ اور اعزاء و اقارب سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور جنگلوں اور غاروں میں زندگی گزارنے ہی کو دین کا مقصود سمجھ بیٹھے۔

غرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی گمراہیاں تصوف اور فقہ کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، انتہا پسندی کا دور دورہ ہے، ایک جانب افراط ہے دوسری جانب تفریط اور رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین افراط و تفریط کے بیچوں بیچ راہ اعتدال ہے، وہ ترک دنیا کو دین نہیں کہتا، بلکہ دنیا کے تمام کاروبار کو شریعت کے قالب میں ڈھال کر تصوف کی راہ سے کار ثواب بنا دینا چاہتا ہے، وہ شریعت و طریقت کے تضاد کو نہیں مانتا، بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہے، شریعت جسم ہے تو طریقت اس کی روح، تصوف "فقہ" کے بغیر ناکارہ ہے اور فقہ تصوف کے بغیر بے جان، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد[1] ہے کہ:-

> "شریعت بغیر طریقت کے نرا فلسفہ ہے، اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ و الحاد۔"

مشہور مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو بڑے درجہ کے صوفی بھی ہیں فرماتے ہیں کہ:-

> "جس شخص کا ظاہر پاک نہ ہو اس کا باطن پاک ہو ہی نہیں سکتا۔"

چھٹی صدی ہجری کے تصوف کے مشہور امام شیخ عبد القاہر سہروردیؒ (یہی بانی سلسلہ سہروردیہ ہیں) نے حضرت سہل بن عبد اللہ کا یہ ارشاد اپنی کتاب[2] میں نقل فرمایا ہے کہ:-

> کل وجد لا یشھد له الکتاب و السنة فباطل-
>
> "جس وجدی کیفیت کی کوئی شہادت قرآن و سنت میں موجود نہ ہو وہ باطل ہے۔"

یہی وہ حقیقت ہے جس کے برملا اظہار کیلئے ہمیں فقہ کے تعارف میں تصوف کا

---

[1] تسہیل قصد السبیل، ص ۸۔
[2] عوارف المعارف، برحاشیہ احیاء العلوم، ص ۲۸۰ ج اول مطبوعہ مصر۔

تعارف بھی خاصی تفصیل سے کرانا پڑا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو افراط و تفریط کی بھول بھلیاں سے محفوظ و مامون فرمائے، اور قرآن و سنت کی صراط مستقیم پر گامزن فرماکر جنت کی لازوال نعمتوں سے مالا مال فرمائے، آمین۔

آمدم بر سر مطلب :۔

اب ہم اپنے اصل موضوع "فقہ" کی جانب لوٹتے ہیں، فقہ کی تعریف پیچھے ضروری تفصیل کے ساتھ سامنے آچکی ہے، جس کا حاصل متاخرین کی اصطلاح کی رو سے یہ ہے کہ :۔

> "انسان کے ظاہری اعضاء سے کئے جانے والے ہر کام کے متعلق قرآن و سنت، اجماع یا قیاس کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے، کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا مباح یا حرام یا مکروہ۔"

موضوع بھی پیچھے معلوم ہوچکا ہے کہ "انسان کے ظاہری اعمال" فقہ کا موضوع ہیں۔

فقہ کے ماخذ یعنی احکام شرعیہ کے دلائل :۔

فقہ کی تعریف کے ذیل میں کئی ورق پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ احکام شرعیہ کے دلائل صرف چار ہیں، قرآن، سنت، اجماع، قیاس، تمام شرعی احکام انہی میں سے کسی نہ کسی دلیل سے حاصل کئے جاتے ہیں، اسی لئے ان کو "فقہ کے ماخذ" بھی کہا جاتا ہے، یہاں ان چاروں ماخذ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

پہلا ماخذ قرآن حکیم :۔

قرآن حکیم کے نام یوں تو بعض علماء کرام[1] نے نوے (۹۰) سے بھی اوپر بتائے ہیں، مگر مشہور نام جو خود قرآن نے بتائے پانچ ہیں :۔

القرآن، الفرقان، الکتاب، الذکر، التنزیل، ان میں بھی سب سے زیادہ مشہور نام "القرآن" ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو کم ازکم اکسٹھ مقامات پر اسی نام

---

[1] مناہل العرفان للزرقانی، ص ۸ ج اول مطبوعہ مصر

سے یاد کیا ہے، مگر اصول فقہ کی کتابوں میں جس نام کا زیادہ استعمال ہوا وہ "الکتاب" ہے۔

جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن نے سورہ فاتحہ کے بعد سب سے پہلی سورت کے بالکل شروع میں اپنا یہی نام بتایا ہے، ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

"یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں"

قرآن حکیم اس کائنات کی مشہور ترین کتاب ہونے کے باعث در حقیقت تو کسی تعارف کا محتاج نہیں، مگر علماء اصول فقہ جنکا منصب ہی یہ ہے کہ جو بات بھی فقہ کے دلائل سے متعلق ہو اسے قاعدہ ضابطہ میں لے آئیں، جو بات کہیں پچی تلی ہو، انہوں نے قرآن حکیم جیسی بدیہی کتاب کی بھی تعریف کی ہے، تعریف بیان کر دینے میں بعض مصلحتیں ان کے پیش نظر تھیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں فائدہ نہیں، بہرحال قرآن حکیم کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے[1] یہ ہے کہ:۔

"قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظ بہ لفظ[2] نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، اور آپؐ سے بغیر کسی شبہ کے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔"

وحی کی دو قسمیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھیجی گئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو یہی قرآن حکیم جس کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہیں، یعنی جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی بعینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، الفاظ کے انتخاب، ترکیب، یا اسلوب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس وحی کو "وحی متلو" کہا جاتا ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، وحی کی یہ قسم پوری کی پوری حفاظ قرآن کے سینوں میں اور قرآنی مصاحف میں ہمیشہ کیلئے اس طرح محفوظ کر دی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بلکہ کوئی نقطہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے نہ بدلا جاسکے گا۔

---

[1] التلویح مع التوضیح، ص ۲۶، ج اول مطبوعہ مصر۔
[2] تسہیل الوصول الی علم الاصول، ص ۲۴ تا ۲۵، مطبوعہ ملتان۔

دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن پاک کا جزء بنا کر نازل نہیں کی گئی، اس کے ذریعہ آپ ؐ کو بہت سی تعلیمات اور شریعت کے احکام اس طرح بتائے گئے ہیں کہ آپ کے قلب مبارک پر صرف معانی و مضامین کا القاء ہوتا تھا، الفاظ اس کے ساتھ نہ ہوتے تھے، ان معانی و مضامین کو آپ ؐ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کبھی اپنے الفاظ سے کبھی اپنے افعال سے اور کبھی دونوں سے بیان فرمایا، وحی کی اس قسم کا نام "وحی غیر متلو" ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اسی وحی کو "حدیث" اور "سنت" کہا جاتا ہے، جس کا مفصل تعارف آگے آرہا ہے۔

تواتر:۔

تواتر کسی خبر کے اس طرح پے درپے نقل ہونے کو کہتے ہیں کہ جب سے وہ خبر وجود میں آئی اس وقت سے اسے ہر زمانے میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد بلا اختلاف نقل کرتی چلی آئی ہو کہ عقل یہ باور نہ کرے کہ ان سب نے سازش کر کے جھوٹ بولا ہو گا یا سب کو مغالطہ لگ گیا ہو گا، جو خبر اس طرح سے تواتر کے ساتھ منقول ہو اسے "متواتر"[1] کہتے ہیں، ایسی خبر دنیا کے تمام قابل ذکر اہل عقل اور ادیان و مذاہب کے نزدیک ہمیشہ قطعی اور ہر شک و شبہ سے بالا تر سمجھی جاتی ہے، اس سے ایسا ہی یقین حاصل ہوتا ہے جیسا مشاہدہ سے ہوتا ہے، ہم نے شہر نیویارک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر امریکہ کے اس شہر کا ذکر اور اس کی متفرق تفصیلات اتنے بے شمار انسانوں سے سنی ہیں کہ عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ نیویارک امریکہ کا کوئی شہر ہی نہ ہو، اور جتنے لوگوں نے، اخبارات اور رسائل نے ہمیں اس کے حالات بتائے ان سب نے سازش کر کے متفقہ طور پر جھوٹ بولا ہو، یا سب ہی کو مغالطہ لگ گیا ہو اور وہ پاکستان کے کسی گاؤں کو امریکہ کا عظیم شہر نیویارک سمجھ بیٹھے ہوں، یہ تواتر ہی ہے جس کی بناء پر ہم نیویارک کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر امریکہ کا بڑا شہر یقین کرنے پر مجبور ہیں، اس یقین کو اگر ہم اپنے ذہن اور حافظہ سے کھرچنے کی کتنی بھی کوشش کریں تو ظاہر ہے کہ بے سود ہوگی۔

تواتر کی یہی وہ قوت ہے جسے اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے، اور خبر متواتر کے ثبوت کو ہر قسم کے جھوٹ اور بھول چوک کے شبہ سے بالا تر قرار دیا ہے، قرآن کریم بھی حرف بہ حرف تواتر ہی کے ساتھ منقول ہے، بلکہ اس کے تواتر کا تو یہ حال ہے کہ جب

---

[1] مقدمہ فتح الملہم، ص ۵ ج اول، بحوالہ فخر الاسلام بزدوی و علامہ جزائری۔

سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ کا کلام بتا کر امت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے اب تک اسے جوں کا توں نقل کرنیوالوں اور حفظ کرنیوالوں کی اتنی بڑی تعداد ہر زمانہ میں رہی ہے کہ کسی بھی زمانہ میں ان کو شمار نہیں کیا جا سکا، ایک نسل دوسری نسل کو اور دوسری تیسری کو اللہ کا یہ پیغام حرف بہ حرف پہنچاتی رہی اور قیامت تک پہنچاتی رہے گی۔

دوسرا ماخذ سنت :۔

(لفظ "سنت" لغت عرب میں "طریقہ اور عادت" کے لئے اور فقہ میں ایسی عبادت کیلئے استعمال ہوتا ہے جو فرض یا واجب نہ ہو، اور علم حدیث اور اصول فقہ کی اصطلاح میں "حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کو سنت کہا جاتا ہے۔" یہاں یہی اصطلاحی معنی مراد ہیں، سنت اور حدیث میں یہ فرق ہے کہ "حدیث" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اقوال کا نام ہے اور "سنت" آپ ؐ کے اقوال و افعال دونوں کا، اقوال کی طرح آپ کے افعال بھی حجت ہیں، یعنی احکام شرعیہ کی دلیل صرف حدیث نہیں، بلکہ سنت ہے جس طرح قرآن حکیم پورا کا پورا وحی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی امور دین کے متعلق سب کی سب وحی ہیں، اور آپ ؐ کے تمام اعمال و اخلاق وحی کے عین مطابق، اس لئے قرآن پاک کے بعد شرعی احکام کا سب سے بڑا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔)

سنت کو خود قرآن نے حجت قرار دیا ہے :۔

آپ کے تمام ارشادات کے وحی ہونے اور افعال کے ہر غلطی سے پاک ہونے کی شہادت قرآن پاک نے قسم کھا کر دی ہے کہ

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ، (النجم: ۱تا۴)

"قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے، یہ تمہارے ساتھ رہنے والے (پیغمبر) نہ راہ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہوئے اور نہ آپ ؐ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر وحی بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ کی بھی وحی ہو جو "قرآن" کہلاتی ہے، خواہ

صرف معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے ' اور خواہ وحی جزئی ہو یا کسی قاعدہ کلیہ کی ہو جس سے اجتہاد فرماتے ہوں)"

سورہ قلم میں بھی آپؐ کے اخلاق و عادات کی عظمت کا اعلان قسم کھا کر کیا گیا ہے :۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ، (القلم : ۴)

"اور بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں ۔"

قرآن ہی نے آپؐ کے پورے طرز زندگی کو سب مسلمانوں کیلئے اللہ کا پسندیدہ نمونہ بنا کر پیش کیا ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ، (احزاب : ۲۰)

"تم لوگوں کیلئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک عمدہ نمونہ تھا ۔"

اسی نمونہ کو اللہ کی محبت کا معیار ٹھہرا کر مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا کہ :۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ، (ال عمران : ۳۱)

"آپؐ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو ' خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے ' اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے ۔"

اور صاف الفاظ میں حکم دیا کہ :۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ، (نساء : ۵۹)

"اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا مانو ۔"

اور بتایا کہ آپؐ کی اطاعت بھی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ، (نساء : ۸۰)

"جس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اسنے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی ۔"

غرض وحی ہونے کے اعتبار سے قرآن و سنت میں کوئی فرق نہیں ' دونوں کی اطاعت واجب ہے ' جو در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے ۔

آثار صحابہ کی فقہی حیثیت :۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، اور وہ یہ کہ بعض شرائط کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے آثار یعنی اقوال و افعال سے بھی شرعی احکام ثابت کرنے میں ایک حد تک استدلال کیا جاتا ہے، مگر ان کے سب اقوال و افعال مکمل دلیل فقہ کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں کچھ تفصیل ہے جو اصول فقہ اور اصول حدیث کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، چونکہ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں بلکہ سنت ہی کے تابع ہے۔ لہٰذا اس دلیل کو الگ شمار نہیں کیا جاتا۔

قرآن و سنت کے درمیان درجہ کا تفاوت :۔

یہ بات پیچھے واضح ہو چکی ہے کہ وحی ہونے کے اعتبار سے قرآن و سنت میں کوئی فرق نہیں، اور دونوں ہی کی اطاعت لازم ہے، مگر اس کے باوجود دو بنیادی فرق ایسے ہیں جن کا اثر فقہ کے بہت سے احکام پر پڑتا ہے۔

(۱)____ ایک یہ کہ قرآن کریم "وحی متلو" ہے اور سنت "وحی غیر متلو"، یعنی جیسا کہ پیچھے بیان ہوا قرآن کریم کے الفاظ اور معنی دونوں وحی ہیں، اور سنت کے صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کئے گئے ہیں، الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو بلا وضو چھونا جائز نہیں جب کہ حدیث شریف کو بلا وضو بھی چھویا جا سکتا ہے، اگرچہ بہتر یہی ہے کہ باوضو ہو کر چھویا جائے، نیز قراءت قرآن جو نماز میں فرض ہے وہ فرض حدیث کے پڑھ لینے سے ادا نہیں ہو سکتا۔

(۲)____ قرآن و سنت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے ____ "قطعی الثبوت" (قطعی اور بالکل یقینی طور پر ثابت شدہ) ہے، اور سنت کی تعلیمات چونکہ سب کی سب تواتر سے ثابت نہیں، لہٰذا اس کی جو تعلیمات تواتر سے ثابت ہو گئیں وہ تو "قطعی الثبوت" ہیں اور جو تعلیمات ہم تک بغیر تواتر کے مگر قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہیں وہ "ظنی الثبوت" (ظنی طور پر ثابت شدہ) ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم کا تو ایک ایک حرف بلکہ زیر، زبر، پیش بھی ہم تک تواتر سے پہنچا ہے، لہٰذا اس کے متعلق ہمیں قطعی علم اور پختہ یقین ہے کہ یہی وہ بعینہٖ کلام ہے، جسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اللہ کا کلام بتا کر پیش کیا تھا، تواتر کی وجہ سے ہمیں اس کے ثبوت کے لئے سند اور راویوں کے حالات کی

جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں کیونکہ سند اور راویوں کے حالات کی چھان بین کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں روایت کرنیوالے تھوڑی تعداد میں ہوں' اور جہاں روایت کرنے والوں کی تعداد ہر زمانہ میں تواتر تک پہنچی ہوئی ہو وہاں سند اور راویوں کی تحقیق کا مطالبہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہو اور لوگوں سے وجود آفتاب کی دلیل مانگ رہا ہو۔

برخلاف سنت کے کہ وہ ہم تک سب کی سب تواتر سے نہیں پہنچی' بلکہ سنت کی کچھ تعلیمات تواتر سے اور کچھ بغیر تواتر کے سند کے ذریعہ پہنچی ہیں' جو تعلیمات بغیر تواتر کے پہنچی ہیں ان کے متعلق یہ علم حاصل کرنے کیلئے کہ یہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تعلیمات ہیں سند کے ایک ایک راوی کے حالات کی مکمل چھان بین اور سند کی نہایت دقیق اور پیچیدہ تحقیقات سے گزرنا پڑتا ہے' جن کے اصول "علم روایت حدیث"' "فن اصول حدیث"' "فن اسماء الرجال" اور "فن اصول فقہ" میں بیان کئے گئے ہیں' ان تمام تحقیقات میں جو حدیث (غیر متواتر) سند کے اعتبار سے قابل اعتماد ثابت ہو اس سے ایک گونہ یقین اس بات کا حاصل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے' مگر اس "ایک گونہ یقین" کے باوجود بھی ضعیف سا احتمال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ سند کے روایوں سے پوری کوشش اور احتیاط کے باوجود بھول چوک ہوگئی ہو' اس لئے ایک گونہ یقین قوت میں اس یقین کے برابر نہیں ہوتا جو قرآن کریم یا سنت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

ظن غالب کی حقیقت اور اس کا درجہ :۔

تواتر سے ہونے والے یقین کو "علم قطعی" کہا جاتا ہے' اور اسکا انکار کفر ہے' اور جو یقین تواتر کے بغیر سند سے حاصل ہو اسے اصطلاح میں "ظن" کہتے ہیں' اس کا انکار گناہ ہے مگر کفر نہیں۔

عام طور پر "ظن" کا اردو ترجمہ صرف "گمان" سے کر دیا جاتا ہے' مگر یاد رہے کہ اصول فقہ کی اصطلاح میں "ظن" سے مراد صرف گمان نہیں' بلکہ ایک درجہ کا یقین مراد ہے' جسے "ظن غالب" کہا جاتا ہے' اور "ظن غالب" دنیا کے تمام ادیان و مذاہب' ہر ملک کے قوانین اور روز مرہ کے معاملات میں قابل اعتماد اور قابل استدلال قرار دیا جاتا ہے' دنیا بھر کی عدالتیں گواہیوں کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے کرتی ہیں' ظاہر ہے کہ محض دو چار گواہوں کا بیان حد تواتر کو نہیں پہنچاتا' اور نہ اس کے بالکل سچ اور درست ہونے کا علم قطعی حاصل ہو سکتا ہے' کیونکہ یہ احتمال عقلی طور پر موجود رہتا ہے کہ ان

چاروں گواہوں نے سازش کر کے جھوٹ بولا ہو یا ان سب کو مغالطہ لگ گیا ہو' لہٰذا ان گواہیوں سے حاصل ہونے والا علم ظن غالب ہی ہے علم قطعی نہیں، علم قطعی تو وہ ہے جس میں عقل کے نزدیک جھوٹ یا مغالطہ کا کوئی احتمال سرے سے باقی ہی نہ رہے' غرض دنیا بھر کی عدالتوں میں گواہیوں پر اعتماد کر کے جو فیصلے کئے جاتے ہیں' وہ "ظن غالب" ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں' اسی طرح جو سنت تواتر سے تو ثابت نہ ہو' مگر ایسی قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہو کہ اس کے درست ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جائے' شریعت میں اس کو حجت (یعنی فقہی دلیل) قرار دیا گیا ہے' یہ اور بات ہے کہ یہ دلیل "ظنی" ہونے کے باعث "قطعی" سے کم درجہ کی ہے

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن و سنت کے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا کا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے' اور سنت کی تمام تعلیمات چونکہ تواتر سے ثابت نہیں' اس لئے سنت متواترہ قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ جو قابل اعتماد سند سے ثابت ہوئی ہو وہ ظنی ہے۔

دلیل قطعی اور دلیل ظنی کے فرق کا اثر احکام پر:۔

دلیل قطعی اور دلیل ظنی میں چونکہ قوت کے اعتبار سے تفاوت ہے لہٰذا ان سے ثابت ہونے والے احکام پر بھی اس تفاوت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ پیچھے احکام شرعیہ کی جو سات قسمیں بیان ہوئی ہیں' یعنی فرض' واجب' مستحب' مباح' حرام' مکروہ تحریمی' مکروہ تنزیہی' ان میں سے فرض اور حرام کا ثبوت صرف دلیل قطعی سے ہو سکتا ہے دلیل ظنی کسی فعل کی فرضیت یا حرمت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں' اور باقی پانچ قسم کے احکام یعنی واجب' مستحب' مباح' مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کا ثبوت "دلیل ظنی" سے بھی ہو سکتا ہے' قرآن کریم اور سنت متواترہ دونوں "قطعی الثبوت" ہیں' لہٰذا ان سے ساتوں قسم کے احکام ثابت ہو سکتے ہیں' اور سنت غیر متواترہ دلیل ظنی ہے' لہٰذا اس سے کسی فعل کا فرض یا حرام ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا' البتہ باقی پانچ قسم کے احکام اس سے بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

مثلاً نماز اس لئے فرض ہے کہ قرآن کریم میں اس کا مطالبہ صراحت سے کیا گیا ہے' اسی طرح مثلاً ہر نماز میں رکعتوں کی ایک خاص تعداد یعنی فجر کی دو' مغرب کی تین' اور باقی تین نمازوں میں چار چار رکعتیں اگرچہ قرآن کریم سے صراحتاً ثابت نہیں مگر سنت متواترہ سے ان کی پابندی ثابت ہے' لہٰذا اس تعداد کی پابندی بھی فرض اور اس میں کمی بیشی حرام ہے' اور نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یا چند آیات

پابندی سے پڑھنے کا مطالبہ نہ قرآن کریم سے صراحتاً ثابت ہے نہ سنت متواترہ سے، بلکہ اس کا ثبوت صرف سنت غیر متواترہ سے ہوا ہے، لہٰذا یہ واجب ہے فرض نہیں۔
فرض اور واجب میں یہی فرق ہے کہ فرض کا مطالبہ دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے اور واجب کا مطالبہ دلیل ظنی سے، لہٰذا عمل تو دونوں پر ضروری ہے، اور خلاف ورزی بھی دونوں کی گناہ ہے، مگر فرض کا انکار کفر ہے، واجب کا انکار کفر نہیں، اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی میں یہ فرق ہے کہ حرام کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہوتی ہے، اور مکروہ تحریمی کی ممانعت دلیل ظنی سے، دونوں کا ارتکاب گناہ ہے مگر حرام کی ممانعت کا انکار کفر ہے، مکروہ تحریمی کی ممانعت کا انکار کفر نہیں۔

فقہ کا تیسرا ماخذ "اجماع" :۔

لغت میں "اجماع" متفق ہونے کو کہتے ہیں، لغوی معنی کے اعتبار سے اتفاق اور اجماع ایک ہی چیز ہے، مگر اصطلاح شریعت میں ایک خاص قسم کے اتفاق کو "اجماع" کہا جاتا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ :۔
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا "اجماع" ہے [۱]
یہ "اجماع" فقہ کا تیسرا ماخذ اور احکام شرعیہ کے چار دلائل میں سے ایک ہے، جس مسئلہ کے شرعی حکم پر اجماع منعقد ہو گیا ہے اسے "اجماعی فیصلہ" یا "مسئلہ اجماعیہ" یا "مسئلہ مجمع علیہا" کہا جاتا ہے، اس کی حیثیت احکام شرعیہ کی دلیل اور فقہ کا ماخذ ہونے کے اعتبار سے وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ جس طرح سنت متواترہ دلیل قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ دلیل ظنی، اسی طرح جو اجماعی فیصلہ ہم تک تواتر سے پہنچا ہو وہ فقہی احکام کے لئے دلیل قطعی ہے، اور جو تواتر کے بغیر قابل اعتماد روایت سے پہنچا ہو وہ دلیل ظنی۔

اجماع کو خود قرآن وسنت نے حجت قرار دیا ہے :۔

قرآن وسنت نے مسلمانوں پر اجماع کی پیروی ایسی ہی لازمی قرار دی ہے، جیسی وحی سے ثابت شدہ احکام کی پیروی لازم ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر شریعت کے احکام بذریعہ وحی آنے کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جانے والا

---

[۱] الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی، ص ۱۰۱ ج ۱، مطبوعہ مصر۔

تھا، ادھر یہ شریعت قیامت تک نافذ رہنی والی اور طرح طرح کے نت نئے مسائل امت کو قیامت تک پیش آنے والے تھے، لہٰذا آئندہ کے مسائل شرعی اصول پر حل کرنے کا انتظام اللہ جل شانہ نے یہ فرمادیا کہ خود قرآن وسنت میں ایسے اصول اور نظائر رکھ دیئے جن کی روشنی میں غور و فکر کر کے ہر زمانہ کے مجتہدین اس وقت کے پیدا شدہ مسائل کا شرعی حکم معلوم کر سکیں، اور جو فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں وہ اپنے متفقہ اقوال یا افعال سے کر دیں، اس کی پیروی بعد کے تمام مسلمانوں پر خود قرآن و سنت کے ذریعہ لازم اور اس کی خلاف ورزی حرام قرار دیدی گئی۔

قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعزاز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت کو ملا ہے، کہ اس کے مجموعہ کو اللہ تعالیٰ نے دینی امور میں ہر خطاء ولغزش سے معصوم اور محفوظ فرما دیا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس امت کے کسی فرد سے دینی امور میں غلطی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ بات تو ہر وقت مشاہدہ میں آتی ہے کہ اس امت میں بھی ہر قسم کے لوگ ہیں، نیکو کار متقی بھی ہیں، فاسق و فاجر بھی، ہر مسلمان سے بلکہ علماء و صلحاء سے بھی فرداً فرداً بہت سے دینی امور میں غلطی ہو جاتی ہے، لہٰذا امت کا ہر فرد تو خطاء ولغزش سے معصوم نہیں، مگر امت کا مجموعہ معصوم ہے، یعنی پوری امت بحیثیت مجموعی متفقہ طور پر کوئی ایسا فیصلہ یا عمل نہیں کر سکتی جو قرآن و سنت اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، جس طرح قرآن و سنت کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی زمانہ کے تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ جو کسی دینی مسئلہ میں ہوا ہو غلط نہیں ہو سکتا، بعد کے تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات قرآنیہ :۔

چنانچہ قرآن کریم نے بتایا کہ آخرت میں جو سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں کو ملے گی وہی سزا ان لوگوں کو دی جائے گی جو مسلمانوں کا متفقہ دینی طریقہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے، ارشاد ہے[1] :۔

(۱) وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (نساء :۱۱۵)

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ آمدی کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام، ص ۱۰۲ تا ص ۱۰۷ ج ا، و تفسیر معارف القرآن، ص ۵۴۶ تا ص ۵۴۷ ج دوم۔

"اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر ظاہر ہوچکا ہو اور سب مسلمانوں کے (دینی) راستہ کے خلاف چلے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اسکو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بہت بری جگہ ہے"

معلوم ہوا کہ امت کے متفقہ فیصلے (اجماع) کی مخالفت گناہ عظیم ہے۔

(۲) قرآن کریم نے اس امت کے مجموعہ کو یہ مژدہ سنایا ہے کہ :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ : ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی امت بنایا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ بنیں"

معلوم ہوا کہ اس امت کے جو اقوال و اعمال متفقہ طور پر ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست اور حق ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو اس ارشاد کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ "یہ امت نہایت اعتدال پر ہے" نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو گواہ قرار دے کر دوسرے لوگوں پر اس کی بات کو حجت قرار دیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اجماع کا حجت ہونا صرف صحابہؓ یا تابعینؒ کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت صرف صحابہؓ و تابعینؒ نہ تھے بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانہ کے مسلمان اللہ کے

گواہ ہوگئے 'جن کا قول حجت ہے ' وہ سب کسی غلط کاری یا گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے [۱]

(۳) قرآن حکیم ہی نے اس امت کو "خیرالامم" قرار دے کر اسکی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتی اور برے کاموں سے منع کرتی ہے 'ارشاد ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

"تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے (نفع و ہدایت پہنچانے کے) لئے ظاہر کی گئی ہے 'تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو 'اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی پوری امت سے بحیثیت مجموعی خطاب ہے 'اور اس میں تین طریقوں سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اس امت کا اجماع شرعی حجت اور فقہی دلیل ہے۔

اول یہ کہ اس امت کو ظاہر ہے کہ بہترین امت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس امت کا مجموعہ دین کی صحیح تعلیمات پر قائم رہے گا 'اگرچہ اس کے بہت سے افراد الگ الگ دین میں کمزور بلکہ بہت کمزور ہوں 'مگر ہر زمانہ میں اس امت کا مجموعہ مل کر اللہ کے دین کو مکمل طور پر تھامے رہے گا ' پورا مجموعہ کبھی گمراہ نہ ہو گا ' لہٰذا ان کا اجماع بھی لامحالہ حجت ہو گا ' اس لئے کہ اگر ان سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو وہ اتفاق گمراہی پر ہو گا ' پھر ایک گمراہ امت بہترین امت کیسے ہو سکتی ہے [۲]؟

دوسرے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے متعلق یہ تصدیق فرمادی ہے کہ "یہ نیک کاموں کا حکم دیتی ہے"، معلوم ہوا کہ جس کام کا یہ حکم دے گی وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور نیک کام ہو گا ' اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ یہ امت متفقہ طور پر جس کام کا حکم دے گی چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے لہٰذا اس کی پابندی سب پر لازم ہوگی۔

تیسرے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ "امت برے کاموں سے منع کرتی

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن للجصاص ' ص ۱۰۱ تا ' ص ۱۰۴ ' ج اول مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ و تفسیر معارف القرآن ' ص ۲۷۳ تا ص ۲۷۳ ' ج اول۔

[۲] دیکھئے شیخ ابو بکر جصاص رازی ؒ کی مشہور کتاب "احکام القرآن" ص ۴۱ ج ۲ ' طبع مصر ' اور تسہیل الوصول ص ۲۷۴ ' طبع ملتان۔

ہے۔" معلوم ہوا کہ جس کام سے یہ امت متفقہ طور پر منع کر دے وہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور برا ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

الحاصل اس امت کا اجماعی فیصلہ خواہ کسی کام کے کرنے کا ہو یا کسی کام سے باز رہنے کا، ہر صورت میں یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے[۱] مطابق ہو گا، ورنہ اگر ان کے فیصلہ کو غلط قرار دیا جائے، یعنی جس کام کا اس نے حکم دیا اسے برا سمجھا جائے اور جس کام سے منع کیا اسے اچھا سمجھا جائے تو لازم آئے گا کہ یہ امت برائی کا حکم دینے والی اور اچھائی سے منع کرنے والی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس آیت کے صریح خلاف ہے[۲]۔

(۴) نیز قرآن کریم کا حکم ہے :-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (ال عمران : ۱۰۳)

"اور اللہ کی رسی (دین) کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

اور ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے متفقہ دینی فیصلے (اجماع) کی مخالفت امت میں پھوٹ ہی ڈالنا ہے، جس سے قرآن کریم نے واضح طور پر ممانعت فرمائی ہے[۳]۔

رہا یہ سوال کہ فقہ کے بے شمار مسائل میں فقہاء کا آپس میں اختلاف ہوا ہے، لہٰذا وہ بھی اس آیت کی رو سے ناجائز ہونا چاہئے؟ جواب یہ ہے کہ فقہاء کا اختلاف جن مسائل میں ہوا ہے ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا صریح فیصلہ قطعی طور پر قرآن وسنت سے یا اجماع امت سے ثابت ہو چکا ہو، فقہاء کا اختلاف صرف ان فروعی مسائل میں ہوا ہے جن میں قرآن وسنت کا کوئی صریح اور قطعی فیصلہ موجود نہیں تھا، یا جن کے متعلق خود احادیث میں اختلاف پایا جاتا تھا، اور ان پر امت کا اجماع بھی منعقد نہیں ہوا تھا، لہٰذا فقہاء کا یہ اختلاف اس آیت کی ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ ان کا اختلاف فروعی مسائل میں اجتہادی نوعیت کا ہے، جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، خود عہد رسالتؐ میں بھی فروعی مسائل میں صحابہؓ کا اختلاف ہوا ہے، جس کی بہت سی مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں، اور آنحضرتؐ نے اس کی کبھی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ ایسے اختلاف

---

[۱] یہ سب تفصیل بھی شیخ ابو بکر جصاص رازیؒ نے "احکام القرآن" میں ذکر فرمائی ہے۔ ص ۱۴ ج ۲۔

[۲] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ آمدیؒ کی الاحکام فی اصول الاحکام، ص ۱۰۹ تا ۱۱۱ ج اول مطبوعہ مصر۔

[۳] حوالہ بالا، ص ۱۱۱ جلد اول و تفسیر قرطبیؒ، ص ۱۶۴ ج ۴، مطبوعہ مصر۔

کو امت کیلئے رحمت قرار دیا ہے اور جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو چکا ہو وہ مسئلہ ظنی یا اجتہادی نہیں رہتا، بلکہ قطعی ہو جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا فقہاء مجتہدین کو بھی جائز نہیں، کیونکہ اس کی مخالفت در حقیقت امت میں پھوٹ ڈالنا ہے، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

(۵) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ، وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ
(توبہ :۱۱۹)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔"

اس آیت میں ہر زمانہ کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ سچے لوگوں "الصادقین" کے ساتھ رہیں، جس کا مقصد ظاہر ہے یہ ہے کہ اعمال میں ان کی پیروی کی جائے، رہا یہ سوال کہ صادقین سے کیسے لوگ مراد ہیں؟ تو اس کا جواب خود قرآن کریم ہی نے سورہ بقرہ کی آیت (نمبر ۱۷۷) لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ ----- تا ----- اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا، وَ اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ میں دیا ہے، وہاں صادقین کی صفات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ صادقین وہ حضرات ہیں جو اعتقاد کے بھی سچے ہوں، قول و عمل کے بھی سچے ہوں اور ظاہر و باطن کے بھی سچے ہوں۔

امام رازی ؒ فرماتے ہیں کہ اس[1] آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صادقین کا وجود ہر زمانہ میں باقی رہے گا، ورنہ ان کے ساتھ رہنے کا حکم ہر زمانہ کے تمام مسلمانوں کو نہ دیا جاتا، کیونکہ اسلام نے کسی کو ایسا حکم نہیں دیا جس پر عمل کرنا اس کی قدرت سے باہر ہو، تو اس آیت سے جب یہ ثابت ہو گیا کہ صادقین ہر زمانہ میں موجود رہیں گے تو یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ کسی زمانہ کے سب مسلمان کسی غلط کاری یا گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے، کیونکہ کچھ لوگ بلکہ اکثر لوگ بھی اگر کوئی غلط کام یا فیصلہ کرنا چاہیں گے تو اس زمانہ کے صادقین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، معلوم ہوا کہ امت کا اجماعی فیصلہ کبھی گمراہی اور بے دینی کی بات پر یا حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

چند احادیث :۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں اجماع کی حقانیت کو اور زیادہ صراحت اور تاکید سے بیان فرمایا، اس سلسلہ کی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا مجموعہ حد

---

[1] تفسیر کبیر، ص ۵۱۳ ج ۴۔

تواتر کو پہنچا ہوا ہے، فقہاء و محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے ان میں سے صرف وہ حدیثیں جو احقر کو سرسری تلاش سے دستیاب ہوگئیں انہی کو روایت کرنے والے صحابہ کرامؓ کی تعداد مجموعی طور پر بیالیس ہے، ذرا اہتمام سے جستجو کی جائے تو اس مضمون کی نہ جانے کتنی حدیثیں جو کتنے ہی مزید صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہوں گی اور مل جائیں، بہرحال جن صحابہ کرامؓ کی روایتیں اس ناچیز کو چند روز کی سرسری تلاش میں ملی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکر (۲) حضرت عمر (۳) حضرت علی (۴) حضرت عبداللہ بن مسعود (۵) حضرت ابن عباس (۶) حضرت عبداللہ بن عمر (۷) حضرت انس (۸) حضرت ابو سعید خدری (۹) حضرت ابو ہریرہ (۱۰) حضرت حذیفہ بن الیمان (۱۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ (۱۲) حضرت معاویہ (۱۳) حضرت جابر بن عبداللہ (۱۴) حضرت ابو مسعود انصاری (۱۵) حضرت ابو ذر غفاری (۱۶) حضرت ثوبان (۱۷) حضرت قدامہ بن عبداللہ بن عمار الکلابی (۱۸) حضرت ابو مالک اشعری (۱۹) حضرت عرفجہ (۲۰) حضرت حارث اشعری (۲۱) حضرت عامر بن ربیعہ (۲۲) حضرت فضالہ بن عبید (۲۳) حضرت ابوبصرہ (۲۴) حضرت زید بن ارقم (۲۵) حضرت جابر بن سمرہ (۲۶) حضرت ابو امامہ (۲۷) حضرت سعد بن ابی وقاص (۲۸) حضرت مرۃ البہزی (۲۹) حضرت قرۃ (۳۰) حضرت عقبہ بن عامر (۳۱) حضرت معاذ بن جبل (۳۲) حضرت جبیر بن مطعم (۳۳) حضرت زید بن ثابت (۳۴) حضرت نعمان ابن بشیر (۳۵) حضرت ابوالدرداء (۳۶) حضرت ابو قرصافہ (۳۷) حضرت اسامہ بن شریک (۳۸) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (۳۹) حضرت عوف بن مالک (۴۰) حضرت عمرو ابن عوف (۴۱) حضرت عثمان غنی (۴۲) حضرت عائشہ[۱] رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان حضرات میں بعض صحابہ کرامؓ نے تو مذکورہ بالا مضمون کی کئی کئی حدیثیں روایت کی ہیں، لہٰذا حجیت اجماع پر دلالت کرنیوالی احادیث کی تعداد تو بہت ہی زیادہ ہو جاتی ہے، پھر صحابہ کرام کے بعد ان احادیث کے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں بڑھتی ہی چلی گئی ہے، ان میں ہر حدیث اگرچہ الگ الگ خبر واحد (غیر متواتر) ہے، اور ان کے الفاظ بھی باہم مختلف ہیں مگر اتنی بات ان سب احادیث میں مشترک اور متواتر[۲] پائی جاتی ہے کہ اس امت کا متفقہ فیصلہ یا عمل ہر خطاء و لغزش سے پاک ہے، اس طرح اجماع کا حجت

---

[۱] ان سب صحابہ کرامؓ کی روایتوں کے مفصل حوالے آگے احادیث کے ذیل میں تفصیل سے آئیں گے۔

[۲] دیکھئے علامہ ابن الہمام کی کتاب "التحریر" کی شرح "التقریر والتحبیر" لابن امیرالحاج، ص ۸۵ ج ۳ مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ

ہونا تواتر سے روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے، یہاں سب احادیث نقل کرنے کا تو موقع نہیں، مثال کے طور پر چند ذکر کی جاتی ہیں

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق کوئی صریح حکم یا ممانعت (قرآن وسنت میں) موجود نہ ہو تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا۔

شاوروا فیہ الفقہاء و العابدین ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ
(الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اھل الصحیح کذا فی مجمع الزوائد[1])

"کہ اس معاملہ میں تم فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور کسی شخصی رائے کو نافذ نہ کرو۔"

معلوم ہوا کہ کسی زمانہ کے فقہاء و عابدین متفقہ طور پر جس چیز کا حکم دیں یا ممانعت کریں، اس کی مخالفت جائز نہیں، کیونکہ ان کا متفقہ فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا[2] ہے کہ:

لاتزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الی یوم القیامۃ

"میری امت میں ایک جماعت (قرب) قیامت تک حق کیلئے سربلندی کے ساتھ برسرپیکار رہے گی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علاوہ مزید آٹھ صحابہ کرامؓ نے بھی تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ (جس سے معنی نہیں بدلتے) روایت کیا ہے، ان حضرات کی روایتیں صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ مستند کتب حدیث میں مذکور ہیں، وہ آٹھ صحابہ کرامؓ یہ ہیں۔

(۱) حضرت[3] مغیرہ بن شعبہ (۲) حضرت[4] ثوبان (۳) حضرت[5] عمر فاروق

---

[1] مجمع الزوائد باب فی الاجماع، ص ۱۷۸ ج اول، طبع بیروت۔
[2] مسلم شریف، کتاب الایمان "باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام"، ص ۸۷ ج اول، طبع کراچی۔
[3] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لاتزال طائفۃ من امتی الخ" ص ۱۰۸۷ ج ۲، طبع کراچی۔
[4] سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، ص ۵۸۳، ۵۸۴، ج ۲، طبع کراچی، سنن ابن ماجہ ابواب الفتن باب مایکون من الفتن، ص ۲۸۳، طبع کراچی،
[5] صحیح بخاری کتاب العلم باب "من یرد اللہ بہ خیرا" الخ ص ۱۶ ج اول۔

(۴) حضرت جابر بن سمرۃ (۵) حضرت ابو ہریرہ (۶) حضرت زید بن ارقم (۷) حضرت ابو امامہ (۸) حضرت[1] مرۃ البہزی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امام بخاری ؒ کی رائے ہے کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے اس سے مراد اہل علم ہیں، بہرحال اس حدیث میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہر زمانے میں حق پر قائم رہے گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس امت کا مجموعہ کبھی کسی گمراہی یا غلط کاری پر متفق نہیں ہو سکتا۔

(۳) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خطبہ دیتے ہوئے مجمع عام میں سنایا[2] کہ :-

لن یزال امر هذه الامة مستقیما حتی تقوم الساعة

"اس امت کی حالت قیامت تک سیدھی اور درست رہے گی۔"

معلوم ہوا کہ پوری امت کا مجموعہ کبھی کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتا۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اجماع کے حجت ہونے پر سب سے زیادہ صریح ہے کہ :-

ان اللہ لا یجمع امتی او قال امة محمد علی ضلالة ، وید اللہ علی الجماعة ومن شذ شذ علی النار

"اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا، اور اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آٹھ صحابہ کرام ؓ نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے، کسی نے تفصیل سے کام لیا ہے کسی نے اختصار سے، مگر اتنا جملہ سب صحابہ کرام ؓ نے نقل فرمایا ہے کہ "امت محمدیہ ؐ کو اللہ تعالیٰ گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔"

---

[1] حضرت عمر ؓ سے حضرت مرۃ البہزی رضی اللہ عنہما تک چھ حضرات صحابہ ؓ کی روایتیں علامہ ہیثمی ؒ نے مجمع الزوائد میں اسانید و متون اور اصل مآخذ کے حوالوں کے ساتھ نقل فرما کر سب کی سندوں کی توثیق فرمائی ہے، البتہ صرف حضرت مرۃ البہزی رضی اللہ عنہ کی روایت جو طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اس کی سند کے متعلق یہ کہا ہے کہ "وفیہ جماعة لم اعرفهم" دیکھئے مجمع الزوائد، ص ۲۸۷ تا ص ۲۸۹ ج ۷ طبع بیروت ۱۹۶۷ء

[2] صحیح بخاری کتاب العلم باب "من یرد اللہ بہ خیرا" الخ ص ۱۶ ج اول۔

اوپر حدیث کے جو الفاظ لکھے گئے ہیں یہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے روایت کردہ ہیں [1] باقی سات صحابہ کرامؓ جنہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے یہ ہیں۔

(۱) حضرت [2] ابن عباس (۲) حضرت [3] انس (۳) حضرت [4] ابو مالک اشعری (۴) حضرت [5] ابو بصرہ (۵) حضرت قدامہ بن عبد اللہ [6] بن عمار الکلابی

---

[1] جامع ترمذی' ابواب الفتن' باب لزوم الجماعۃ، ص ۳۹ ج ۲' طبع کراچی و مستدرک حاکم کتاب العلم' ص ۱۱۵ تا ۱۱۶ ج اول' طبع دکن ۱۳۳۴ھ ترمذی نے اس حدیث کو "حدیث غریب من ہذا الوجہ" کہا ہے' مگر یہ "غریب" کہنا سند کے ایک خاص طریق کی بناء پر ہے۔ ورنہ حاکم نے اسی حدیث کی سند سات مختلف طرق سے بیان کی ہے' ان سب طرق کا مدار "معتمر بن سلیمان" پر ہے' جو ائمہ حدیث میں سے ہیں' اور ان میں کئی طریق سند کے لحاظ سے صحیح ہیں' چنانچہ طریق اول میں معتمر کے شاگرد خالد کے متعلق حاکم فرماتے ہیں کہ "خالد بن یزید القرنی شیخ قدیم للبغدادیین ولو حفظ ہذا الحدیث لحکمنالہ بالصحۃ" پانچواں طریق جس میں معتمر کے شیخ" سالم بن ابی الزیال" ہیں اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ھذا لو کان محفوظا من الراوی لکان من شرط الصحیح" کیونکہ بقول حافظ ابن حجر سالم بن ابی الذیال ثقہ ہیں' اور ان سے ایک حدیث صحیح مسلم میں مروی ہے (تقریب التہذیب' ص ۲۱۲ ج اول)
حاکم نے ساتوں طریق بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ "ان المعتمربن سلیمان احد ائمة الحدیث وقد روی عنه هذا الحدیث باسانید یصح بمثلها الحدیث فلابدان یکون له اصل باحد هذه الاسانید" حاکم کی اس پوری تحقیق پر حافظ ذہبیؒ نے سکوت فرمایا ہے جو ان کی توثیق کی علامت ہے)۔

[2] جامع ترمذی حوالہ بالا و مستدرک حاکم حوالہ بالا' ص ۱۱۶ ج اول۔

[3] سنن ابن ماجہ ابواب الفتن' باب السواد الاعظم' ص ۲۸۳' طبع کراچی و مستدرک کتاب العلم ص ۱۱۶ و ۱۱۷ ج اول و کتاب الفقیہ والمتفقہ للخطیب ص ۱۶۱ جز و پنجم مطبوعہ ریاض' ۱۳۸۹ھ۔

[4] سنن ابی داؤد' کتاب الفتن' ص ۵۸۴' ج ۲' طبع کراچی' و جمع الفوائد' ص ۵۸۴ ج ۲' طبع المدینہ للنورۃ' ابو داؤد نے ابو مالک اشعری کی اس روایت پر سکوت کیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک قابل استدلال ہے۔

[5] مجمع الزوائد بحوالہ مسند احمد' باب فی الاجماع' ص ۱۷۷ ج اول' طبع بیروت ۱۹۶۷ء' والتقریر والتحبیر بحوالہ احمد والطبرانی' ص ۸۵ ج ۳' ابن امیر الحاج "التقریر" میں نقل فرماتے ہیں کہ: ابو بصرہ کی اس روایت کے تمام راوی "رجال صحیح" ہیں' سوائے ایک تابعی کے جو مبہم ہے' لیکن اس روایت کا ایک شاہد حدیث مرسل ہے' جس کے سب رجال صحیح ہیں' اسے طبریؒ نے سورہ انعام کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

[6] مستدرک حاکم' ص ۵۰۷ ج ۴' حاکم حضرت قدامہ کی اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ: "هذا الحدیث لم نکتب بهذا الاسناد الاحدیثا واحدا" حافظ ذہبیؒ نے یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ[1] (۷) حضرت[2] ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان آٹھ صحابہ کرام کے علاوہ اس حدیث کو مشہور تابعی حضرت حسن بصریؒ نے کسی صحابی کا حوالہ دیئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت[3] کیا ہے۔

۵۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حاضرین کے سامنے خطبہ دیا' اور فرمایا کہ آج میں تمہارے سامنے اس طرح خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے کھڑے ہوئے تھے' اور آپؐ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا[4] تھا کہ

اوصیکم باصحابی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ، ثم یفشو الکذب حتی یحلف الرجل ولایستحلف ویشهد ولایستشهد ، فمن اراد منکم بحبوحة الجنة فلیلزم الجماعة فان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعد ، (رواه الترمذی فی الجامع والحاکم فی المستدرک واللفظ له قال الحاکم هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه واقره الذهبی)

"میں تم کو اپنے صحابہ (کی پیروی) کی وصیت کرتا ہوں' پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان کے بعد ہوں گے' (یعنی تابعین) پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان (تابعین) کے بعد ہوں گے (یعنی تبع تابعین) پھر جھوٹ پھیل جائے گا حتی کہ آدمی قسم کھائے گا' حالانکہ اس سے کسی نے قسم کا مطالبہ نہ کیا ہو گا اور گواہی دے گا حالانکہ اس سے کسی نے گواہی طلب نہ کی ہو گی' پس تم میں سے جو شخص جنت کے بیچوں بیچ رہنا چاہتا ہو

---

[1] کتاب الفقیہ و المتفقہ للخطیب البغدادی' ص ۱۶۲ جزو خامس' مطبوعہ ریاض' خطیب نے ابو ہریرہؓ کی یہ روایت اپنی سند سے بیان کی ہے' اور سند پر کوئی کلام نہیں کیا۔

[2] مستدرک حاکم' ص ۵۰۷ ج ۴ و فتح الباری' ص ۳۱' ج ۱۳ مطبوعہ بیروت ۱۳۰۱ھ' حافظ ابن حجرؒ اور حاکم نے ابو مسعود انصاری ﷺ کی یہ روایت موقوفاً" بیان کی ہے' حافظ ابن حجرؒ نے سکوت فرمایا ہے کہ جو ان کی توثیق کی علامت ہے' اور حاکم نے اسے "صحیح" علی شرط مسلم قرار دیا ہے' اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث ہم نے مسندا (غالبا مرفوعا مراد ہیں' رفع) بھی اپنے پاس لکھی ہے' مگر اس کی سند شرط مسلم کے معیار پر نہیں (اس لئے مستدرک میں اسے ذکر نہیں کیا) حافظ ذہبیؒ نے حاکم کی اس پوری تحقیق پر یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

[3] دیکھئے التقریر والتحبیر، ص ۸۵ ج ۳' و تفسیر ابن جریر طبری' سورہ انعام ص' ۱۲ ج ۷' علامہ ابن امیر الحاج نے حضرت حسن بصریؒ کی اس مرسل روایت کے بارے میں کہا ہے کہ "اس کے تمام راوی صحیح کے رجال ہیں"

[4] جامع الترمذی' ص ۴۸' ۴۹ ج ۲ مطبوعہ قرآن محل کراچی' و مستدرک حاکم' ص ۱۱۴ ج ۱' امام ترمذی نے اس حدیث کو "حسن صحیح غریب من ہذا الوجہ" کہا ہے' اور حاکم اور حافظ ذہبی دونوں نے اسے "صحیح علی شرط الشیخین" قرار دیا ہے۔

وہ "الجماعۃ [1] (مخصوص جماعت) کو لازم پکڑ لے (یعنی اپنے اعتقاد اور افعال میں اس جماعت کا اتباع کرے) کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے زیادہ دور رہتا ہے۔"

اس حدیث میں رسول ﷺ نے تبع تابعین کے بعد دنیا میں جھوٹ پھیل جانے کی خبر دی ہے، مگر ساتھ ہی "الجماعۃ" (مخصوص جماعت) کے ساتھ رہنے اور اس کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دینی اعتبار سے بگڑے ہوئے زمانے میں بھی امت میں ایک خاص "جماعت" ایسی موجود رہے گی جو حق پر ہوگی، اور اس کا اتباع واجب ہوگا، جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو پیچھے کئی آیات و احادیث سے معلوم ہو چکا ہے، کہ امت کا پورا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگا، رہی یہ بات کہ "الجماعۃ" سے مسلمانوں کی کیسی جماعت مراد ہے؟ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

"الجماعۃ" کے ساتھ رہنے اور اس کے اتباع کے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو حکم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث میں نقل فرمایا ہے اسے چار اور صحابہ کرام (۱) حضرت سعد [2] بن ابی وقاص (۲) حضرت [3] عبداللہ بن عمرؓ (۳) حضرت [4] حذیفہ اور (۴) حضرت [5] معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے۔

۶- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منی کی مسجد خیف میں خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا کہ

ثلاث لایغل علیھن قلب مسلم اخلاص العمل للہ، و النصیحۃ للمسلمین، ولزوم جماعتھم فان دعوتھم تحیط من ورائھم-

"تین خصلتیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا، عمل میں اللہ کیلئے اخلاص، مسلمانوں کی خیر خواہی اور جماعت مسلمین کا اتباع، کیونکہ انکی دعا پیچھے سے

---

[1] "الجماعۃ" عربی زبان میں مخصوص جماعت کو کہتے ہیں، جس کی تشریح آگے آئے گی۔
[2] مستدرک حاکم، ص ۱۱۴ و ۱۱۵، ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو بھی سنداً "صحیح" قرار دیا ہے
[3] مستدرک حاکم، ص ۱۱۴ ج اول۔
[4] صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب کیف الامر اذالم یکن جماعۃ، ص ۱۰۴۹ ج ۲ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظھور الفتن، ص ۱۲۷ ج ۲،
[5] مشکوۃ شریف، ص ۳۱ ج اکتاب العلم باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ بحوالہ مسند احمد۔

ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے ”جو ان کو (گمراہی اور نفس و
شیطان کی حیلہ سازیوں سے بچاتی ہے)۔“

معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے اعتقاد اور عمل میں جماعت مسلمین کا اتباع کرے گا، خیانت اور گمراہی سے محفوظ رہے گا، اس حدیث کا حاصل بھی وہی ہے کہ جماعت مسلمین کا متفقہ عقیدہ یا عمل کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

اس حدیث کو دس صحابہ کرام نے روایت کیا ہے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔
(۱) حضرت[۱] ابن مسعود (۲) حضرت[۲] انس (۳) حضرت جبیر[۳] بن مطعم (۴) حضرت[۴] زید بن ثابت (۵) حضرت نعمان[۵] بن بشیر (۶) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ[۶] (۷) حضرت ابو الدرداءؓ (۸) حضرت معاذ بن جبل (۹) حضرت جابر (۱۰) حضرت[۷] ابو

---

[۱] مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ص ۳۵ ج اول، اصح المطابع کراچی (بحوالہ امام شافعی و بیہقی) نیز دیکھئے "الرسالۃ" امام شافعیؒ الجزء الثالث، ص ۴۰۱ تا ص ۴۰۳ (مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۵ھ) امام شافعیؒ نے اس حدیث سے بھی اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔

[۲] مسند احمد، ص ۲۲۵ ج ۳، مطبوعہ بیروت

[۳] سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الخطبہ یوم النحر، ص ۲۱۹، (اصح المطابع کراچی)، ابن ماجہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد خطبہ حجۃ الوداع میں منیٰ کی مسجد خیف میں فرمایا تھا، اور مجمع الزوائد میں تو اس کی پوری صراحت ہے، دیکھئے مجمع الزوائد ص ۱۳۷ تا ۱۳۹ ج ۱، و مسند احمد، ص ۸۰ و ۸۲ ج ۴ و مستدرک حاکم، کتاب العلم باب ”ثلاث لایغل علیھن الخ“، ص ۸۶ تا ۸۸ ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے انکی روایت کو ”صحیح علی شرط الشیخین“ کہا ہے۔

[۴] مسند احمد، ص ۱۸۳ ج ۵۔

[۵] مستدرک، کتاب العلم، باب ”ثلاث لا یغل علیھن الخ ص ۸۸ ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو ”صحیح علی شرط مسلم“ قرار دیا ہے۔

[۶] حضرت ابو سعید خدریؓ سے حضرت ابو قرصافہؓ تک پانچ صحابہ کرام کی روایتیں علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں قدرے ضعیف یا غیر موثوق سندوں سے ذکر کی ہیں۔ ص ۱۲۷ تا ص ۱۳۹ ج ۱۔

[۷] ابو قرصافہ، ان کی کنیت اور نام "جندرۃ بن خیشنۃ" ہے، علامہ ابن الاثیر جزریؒ نے اسد الغابہ میں کہا ہے کہ یہ صحابی ہیں، فلسطین جاکر آباد ہوگئے تھے، شام کے محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اسد الغابہ میں ان کے والد کا نام ایک جگہ "خیشنتہ" اور دوسری جگہ "حبشیۃ" لکھا ہے، بہ ظاہر پہلا ہی نام صحیح ہے، کیونکہ اس کے حروف کو علامہ جزریؒ نے ضبط کیا ہے، دوسرے کو ضبط نہیں کیا، دیکھئے اسد الغابہ ص ۳۰۷ و ص ۲۷۷ ج ۵، مجمع الزوائد میں ان صحابی کا نام ”حیدرہ بن خیشمہ“ لکھا ہے، جو بظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، دیکھئے مجمع الزوائد ص ۱۲۸ ج ۱۔

قرصافہ، رضی اللہ عنہم اجمعین

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-

یداللہ علی الجماعة ، ومن شذ شذ الی النار ۔

"اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے، اور جو شخص (ان سے) الگ راستہ اختیار کریگا جہنم کی طرف جائے گا۔"

معلوم ہوا کہ "الجماعة" (مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت) کو اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و رہنمائی حاصل ہے، جو اس کو ہر خطاء سے بچاتی ہے، ان کے متفقہ عقیدہ یا عمل کے خلاف جو بات ہوگی غلط اور باطل ہوگی، اسی لئے پچھلی احادیث میں "الجماعة" کے اتباع کا حکم بڑی تاکید سے دیا گیا ہے، اور یہاں "الجماعة" سے الگ راستہ اخیار کرنیوالوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کا راستہ جہنم کا راستہ ہے۔

یہ حدیث حضرت[1] عبداللہ بن عمرؓ نے روایت کی ہے، اور اس کا پہلا جملہ "یداللہ علی الجماعة" مزید دو صحابہ کرام (۱) حضرت[2] عبداللہ بن عباس اور (۲) حضرت[3] عرفجہ رضی اللہ عنہما نے بھی روایت کیا ہے۔

۸۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

من فارق الجماعة شبرا فمات مات میتة جاهلية

(رواہ البخاری و مسلم والخطیب وغیرہم عن ابن عباس وغیرہ)

"جس شخص نے جماعت (مسلمین) سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں مرگیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا"

"جاہلیت" قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس دور کو کہا گیا ہے جب عرب میں کفر کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور اسلام کا سورج طلوع نہ ہوا تھا، اس حدیث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "الجماعة" سے علیحدگی اختیار کرنے یعنی ان کے متفقہ فیصلے، عقیدے یا عمل کی مخالفت کو کتنا سنگین جرم قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے اس کی ممانعت میں اتنی تاکید سے کام لیا کہ معتبر کتب حدیث میں صرف اسی مضمون کی

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب لزوم الجماعة ص ۳۹ ج ۲، و مستدرک کتاب العلم، ص ۱۱۵ ج ۱، اس حدیث کی سند کا مفصل حال حدیث نمبر ۴ کے متعلقہ حاشیہ میں پیچھے بیان ہوچکا ہے، کیونکہ یہ حدیث درحقیقت حدیث نمبر ۴ ہی کا آخری حصہ ہے۔

[2] جامع ترمذی حوالہ بالا و مستدرک حوالہ بالا، ص ۱۱۶ ج ۱۔

[3] سنن نسائی، ص ۱۵۸ ج ۲، و کتاب الفقہ والمتفقہ، ص ۱۶۲ جزو خامس

١٨) حدیثیں راقم الحروف کو ملی ہیں جو سولہ (١٦) صحابہ کرام نے روایت کی ہیں، ان میں "الجماعة" سے علیحدگی کی نہ صرف شدید مذمت کی گئی، بلکہ اس پر دنیا و آخرت کی سخت سزائیں مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں بیان فرمائی ہیں، کئی حدیثوں میں ارشاد ہے کہ جس نے "الجماعة" سے بالشت بھر علیحدگی اختیار کی اور مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا، کچھ حدیثوں میں ارشاد ہے کہ :-

فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه

"اس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن سے نکال دیا۔"

کہیں ارشاد ہے کہ :-

دخل النار۔

"وہ آگ میں داخل ہوگا۔"

کہیں ارشاد ہے کہ :-

فلا حجة له۔

"اس کے پاس کوئی دلیل نہ رہی (جس کی بناء پر اسے معذور قرار دیا جاسکے اور وہ عذاب سے بچ سکے)"

کہیں ارشاد ہے :-

فلا تسئل عنهم۔

"ایسے لوگوں کا کچھ حال نہ پوچھو (کہ ان پر آخرت میں کیا عذاب ہونے والا ہے)"

کہیں فرمان ہے کہ :-

فاقتلوه۔

"اسے قتل کر ڈالو"۔

کہیں حکم ہے کہ :-

فاضربوا عنقه كائنا من كان

"اس کی گردن مار دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔"

کہیں فرمایا کہ :-

فان الشيطان مع من فارق الجماعة يركض

"جو شخص "الجماعة" سے علیحدگی اختیار کرے اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو اسے گناہوں کی طرف ایڑ لگاتا (دوڑاتا) رہتا ہے۔"

کہیں فرمایا :-

اقتلوا الفذ من کان من الناس

"علیحدگی اختیار کرنے "الجماعة" کی مخالفت کرنے) والے کو قتل کردو، وہ کوئی بھی آدمی ہو۔"

کہیں ارشاد ہے کہ :-

و اما ترک السنة فالخروج من الجماعة

"ترک سنت یہ ہے کہ "الجماعة" سے خارج ہو جائے"

ایک حدیث صحیح میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ کسی کلمہ گو مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں حلال ہوتا ہے جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ :-

التارک لدینہ المفارق للجماعة

"اپنے دین کو چھوڑنے والا (یعنی) "الجماعة" سے علیحدگی اختیار کرنے والا ہو۔"

جن صحابہ کرامؓ نے یہ حدیثیں روایت کی ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔
(۱) حضرت [1] ابن عباسؓ (۲) حضرت [2] عثمان غنیؓ (۳) حضرت [3] عرفجہؓ
(۴) حضرت [4] اسامہ بن شریکؓ (۵) حضرت [5] عائشہؓ

---

[1] صحیح بخاری، اول کتاب الفتن، باب ما جاء فی قول اللہ "واتقوا فتنة لاتصیبن الذین ظلموا ص ۱۰۴۵- ج ثانی، و صحیح مسلم کتاب الامارة باب وجوب ملازمة المسلمین، ص ۱۲۸ ج ثانی، و کتاب الفقیه و المتفقه ص ۱۶۴ جزو خامس،
[2] ان کی روایت "التارک لدینہ المفارق للجماعة" کیلئے دیکھئے جامع ترمذی باب ماجاء لا یحل دم امرا مسلم الابا حدی ثلاث، ابواب الدیات، ص ۲۰۳، ج اول۔
[3] ان کی روایت "فاضربوہ بالسیف" کے لئے دیکھئے صحیح مسلم کتاب الامارة، باب حکم من فرق امر المسلمین ص ۱۲۸ ج ثانی و سنن نسائی، کتاب المحاربة "قتل من فارق الجماعة" ص ۱۵۸ ج ثانی و سنن ابوداؤد، کتاب السنة- باب قتل الخوارج، ص ۶۵۵ ج ثانی۔
[4] ان کی روایت "فاضربوا عنقه" کیلئے دیکھئے سنن نسائی، حوالہ بالا۔
[5] ان کی روایت "التارک لدینہ المفارق للجماعة" کیلئے دیکھئے صحیح مسلم، کتاب القسامة و القصاص باب مایباح بہ دم المسلم، ص ۵۹ ج ثانی، و ترمذی ابواب الدیات باب ما جاء لایحل دم امرا مسلم الخ ص ۲۰۳ ج اول۔

(۶) حضرت [1] ابو ہریرہؓ (۷) حضرت [2] ابو ذر غفاریؓ (۸) حضرت حارث [3] اشعری (۹) حضرت [4] معاویہ (۱۰) حضرت [5] ابن عمر (۱۱) حضرت حذیفہ [6] (۱۲) حضرت عامر [7] بن ربیعہؓ (۱۳) حضرت فضالہ [8] بن عبید (۱۴) حضرت ابن مسعود [9] (۱۵) حضرت ابو [10] مالک اشعری

---

[1] ان کی روایت "مات میتۃ جاھلیۃ" کیلئے دیکھئے سنن نسائی کتاب المحاربۃ "التغلیظ فیمن قاتل تحت رایۃ عمیۃ، ص ۱۶۸ ج ثانی ومستدرک کتاب العلم "من فارق الجماعۃ الخ" ص ۱۱۸' و ۱۱۹ ج اول' حاکم اور ذہبی نے ابو ہریرہؓ کی اس روایت کی سند کے متعلق کہا ہے کہ "قد اتفقا علی اخراج ابی ہریرۃؓ فی مثل ہذا۔"
نیز ابو ہریرہ ﷺ ہی کی روایت "واما ترک السنۃ فالخروج من الجماعۃ" کیلئے دیکھئے مستدرک کتاب العلم' ص ۱۲۰ ج اول' اس روایت کو حاکم اور ذہبی نے "صحیح علی شرط مسلم" قرار دیا ہے'

[2] ان کی روایت "فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ" کیلئے دیکھئے سنن ابو داؤد' کتاب السنۃ باب قتل الخوارج ' ص ۶۵۵ ج ثانی' ابو داؤد نے ان کی روایت کی سند پر کوئی کلام نہیں کیا' نیز دیکھئے مستدرک ص ۱۱۷ ج اول' قال الذہبی فی سندہ "خالد لم یضعف۔"

[3] ان کی روایت میں بھی وہی الفاظ ہیں جو ابوذر ﷺ کی روایت میں ہیں' دیکھئے جامع ترمذی ابواب الامثال باب ماجاء فی مثل الصلوٰۃ و الصیام الخ ص ۱۲۹ ج ۲' امام ترمذیؒ نے ان کی روایت کو "حدیث حسن صحیح غریب" کہا ہے' اور اسی حدیث کا ایک اور طریق بھی بیان کیا ہے' نیز دیکھئے مستدرک کتاب العلم ص ۱۱۷ اور ۱۱۸ ج اول۔

[4] مستدرک' ص ۱۱۸ ج اول' حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت "من فارق الجماعۃ شبرا دخل النار" کی سند پر سکوت کیا ہے۔

[5] ان کی روایت "فلا حجۃ لہ" کی سند کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "قد اتفقا علی اخراج ابی ہریرۃ مثل ہذا" دیکھئے مستدرک مع تلخیص ص ۱۱۸ اور ۱۱۹ ج اول' نیز ابن عمر ﷺ ہی کی ایک اور روایت "اخرج من عنقہ ربق اسلام" کے لئے دیکھئے کتاب الفقیہ والمتفقہ، ص ۱۶۴ جزو خامس۔

[6] مستدرک ص ۱۱۹ ' ج اول' حافظ ذہبی نے ان کی روایت کردہ حدیث کو "صحیح" کہا ہے۔

[7] ان کی روایت "مات میتۃ جاھلیۃ" کیلئے دیکھئے کتاب الفقیہ والمتفقہ، ص ۱۶۳' جزو خامس۔

[8] مستدرک ص ۱۱۹ ج اول' حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت "فلا تسال عنھم" کو صحیح علی شرط الشیخین" کہا ہے۔

[9] ان کی روایت "فاقتلوہ" کیلئے دیکھئے کتاب الفقیہ و المتفقہ، ص ۱۶۴' جزو خامس' نیز ان کی ایک اور روایت "التارک لدینہ المفارق ل للجماعۃ" کیلئے دیکھئے کتاب القسامۃ والقصاص باب مایباح بہ دم المسلم ص ۵۹ ج ۲ و ترمذی ابواب الدیات باب ما جاء لایحل دم امرا مسلم، ص ۲۰۳ ج اول۔

[10] حوالہ بالا ایضا

(۱۶) حضرت[1] ابوبکر رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۹۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے[2] سنا ہے کہ:۔

ان امتی لا تجتمع علی ضلالۃ فاذا رایتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم۔

"میری امت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی پس جب تم (لوگوں میں) اختلاف دیکھو تو "سواد اعظم" کو لازم پکڑ لو (یعنی اس کا اتباع کرو)۔"

اس حدیث کا پہلا جملہ تو پیچھے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آچکا ہے، یہاں اس کا دوسرا جملہ "پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑ لو" بیان کرنا مقصود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دوسرا جملہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابن[3] عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک اور روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:۔

فاتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار۔

"پس تم "سواد اعظم" کا اتباع کرو، کیونکہ جو شخص الگ راستہ اختیار کریگا جہنم میں جائیگا۔"

معلوم ہوا کہ امت کا "سواد اعظم" ہمیشہ حق پر رہے گا، یعنی کبھی غلط بات پر متفق نہ ہوگا، ورنہ اس کے اتباع کا حکم نہ دیا جاتا۔

"الجماعۃ" اور "سواد اعظم" سے کیا مراد ہے؟

"السواد الاعظم" عربی زبان میں "عظیم ترین جماعت" کو کہا جاتا ہے، یہاں

---

[1] یہ اسم گرامی سب سے پہلے لکھنا چاہئے تھا، مگر ان کی روایت "اقتلوا الفذ" الخ جس سند سے منقول ہے، اس میں ایک راوی "صالح بن میتم" ہیں جن کے متعلق حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "میں ان کو نہیں جانتا اس سند کے باقی سب راوی ثقہ ہیں"، دیکھئے مجمع الزوائد، ص ۲۲۳ ج سادس،

[2] سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب السواد الاعظم، ص ۲۸۳

[3] مستدرک کتاب العلم ص ۱۱۵ ج اول، حاکم نے ابن عمر کی یہ روایت دو طریق سے نقل کی ہے اور دونوں کے بارے میں صحت سند کا رجحان ظاہر کیا ہے، مگر صحت کا فیصلہ نہیں کیا، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سکوت کیا ہے۔

مسلمانوں کا وہ فرقہ مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کے طریقہ پر ہو، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام کے طریقہ کو حق اور واجب الاتباع سمجھتا اور اس کی مخالفت کو باطل قرار دیتا ہو، چنانچہ چار صحابہ کرام حضرت ابو الدرداء، حضرت ابو امامہ، حضرت واثلہ بن الاسقع اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کی روایت [1] ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "سواد اعظم کیا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ لوگ جو اس طریقہ پر ہوں جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے۔" یہی مضمون اگلی حدیث میں بھی وضاحت سے آرہا ہے :۔

۱۰۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان [2] ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :۔

> ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة، وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالو امن هی یا رسول الله؟ قال ما انا علیه و اصحابی –
>
> "بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، یہ سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ کونسا فرقہ ہے؟ فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ مزید پانچ صحابہ کرام نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ روایت کیا ہے، جن کے اسماء گرامی یہ ہیں :۔

---

[1] مجمع الزوائد، کتاب العلم "باب ماجاء فی المراء" ص ۱۵۶، ج اول و کتاب الفتن، باب افتراق الامم ص ۲۵۹ ج سابع بحوالہ طبرانی الکبیر، حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ "اس کی سند میں ایک راوی "کثیر بن مروان" ہیں جو بہت ضعیف ہیں۔" لیکن راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جو مضمون اس روایت میں بیان کیا گیا ہے وہی مضمون اگلی حدیث نمبر ۱۰ میں قوی سند کے ساتھ آرہا ہے، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مضمون کے ثابت ہونے میں کوئی اشکال نہیں، (رفیع)

[2] جامع ترمذی، ابواب الایمان، "باب افتراق ہذہ الامة، ص ۱۰۴ ج ثانی، امام ترمذیؒ نے یہ حدیث قوی سند سے روایت کی ہے، اور اسے "حسن" قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ "ھذا حدیث حسن غریب مفسر لا نعرف مثل ہذا الامن ھذا الوجہ۔"

(۱) حضرت[۱] معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) حضرت عوف[۲] بن مالک (۳) حضرت[۳] انس (۴) حضرت[۴] عمرو بن عوف (۵) حضرت ابو[۵] امامہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان سب حضرات کی روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرنے میں متفق ہیں کہ میری امت بہتر فرقوں[۶] میں بٹ جائے گی، جن میں سے ایک فرقہ نجات پائے گا باقی سب فرقے آگ میں جائیں گے، رہا یہ سوال کہ وہ نجات یافتہ فرقہ کونسا ہے؟ تو اس کا جواب ان روایتوں میں مختلف الفاظ میں دیا گیا ہے، ایک جواب حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی روایت میں اوپر آیا ہے کہ "وہ فرقہ وہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔" یہ وہی بات ہے جو پچھلی حدیث (نمبر ۹) میں "السواد الاعظم" کے متعلق فرمائی گئی ہے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس فرقہ کو "السواد الاعظم" کے نام سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ وہ فرقہ "الاسلام و جماعتہم" ہے، یعنی "اسلام اور مسلمانوں کی جماعت" باقی تینوں صحابہ کرام کی روایتوں میں ہے کہ وہ فرقہ "الجماعة" ہے۔

روایات کی اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آئیں:۔

۱۔ وہ نجات یافتہ فرقہ ان لوگوں کا ہے "جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام کی سنت کے پیرو ہوں گے۔

۲۔ یہاں جو صفت اس نجات یافتہ فرقہ کی بیان فرمائی گئی وہی صفت پیچھے حدیث نمبر ۹ میں "السواد الاعظم" کی بیان کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کا نام "السواد الاعظم" ہے۔

---

[۱] سنن ابو داؤد اول کتاب السنة، ص ۶۳۱ ج ثانی، و مشکوۃ، ص ۳۰ ج اول بحوالہ ترمذی۔
[۲] سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب افتراق الامم، ص ۲۸۷
[۳] مجمع الزوائد، کتاب قتال اهل البغی، باب ماجاء فی الخوارج، ص ۲۲۶ ج سادس، وباب افتراق الامم ص ۲۵۸ ج سابع، و کتاب الفقیه و المتفقه (للخطیب) ص ۱۶۵ جزو خامس۔
[۴] مجمع الزوائد، کتاب الفتن، باب افتراق الامم، ص ۲۶۰ ج ۷۔
[۵] حوالہ بالا، ص ۲۵۸، ج ۷ بحوالہ "طبرانی فی الاوسط والکبیر" علامہ ہیثمی " نے اس کی سند کی توثیق کی ہے۔
[۶] سوائے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے کہ انہوں نے کل بہتر کا عدد روایت کیا ہے، باقی مضمون انہوں نے بھی وہی نقل فرمایا ہے جو دوسرے صحابہ کرام کی روایتوں میں ہے۔

۳۔ اس نجات یافتہ فرقہ کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض روایات میں "السواد الاعظم" اور بعض روایات میں "الجماعة" بتایا ہے۔

ان تینوں باتوں کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ "السواد الاعظم" اور "الجماعة" در حقیقت اس نجات پانے والے ایک فرقہ کے دو نام ہیں' اور یہ فرقہ ایسے لوگوں کا مجموعہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر قائم ہوں' صرف انہی لوگوں کا راستہ راہ ہدایت و نجات ہے' اس کے خلاف سب راستے گمراہی اور جہنم کی طرف جاتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ پیچھے حدیث نمبر۵ تا نمبر۹ میں "الجماعة" اور "سواد اعظم" کے اتباع کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے' جن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ "ان پر اللہ کا ہاتھ ہے۔" ان کے اتباع کی تاثیر یہ بتائی گئی کہ وہ نفس و شیطان کے حیلہ سازیوں سے بچاتا ہے' اور اس کی مخالفت کی سزا دنیا میں سزائے موت اور آخرت میں جہنم کی آگ مقرر فرمائی گئی ہے' (نعوذ باللہ منہما)۔

بہرحال زیر بحث حدیث نمبر۱۰ سے بھی وہ بات معلوم ہوئی جو پچھلی تمام احادیث سے ثابت ہوتی آرہی ہے' کہ امت میں فساد اور بگاڑ پھیل جانے کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ حق پر قائم رہے گا' پوری امت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہ ہو گا' جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو "حجیت اجماع" کا حاصل ہے کہ "امت کا متفقہ عقیدہ' عمل یا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا' اس کا اتباع فرض اور مخالفت سخت حرام ہے۔

یہاں تک حجیت اجماع پر ہم نے قرآن حکیم کی پانچ آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دس حدیثیں بیان کی ہیں جو بیالیس صحابہ کرام نے راویت کی ہیں' ظاہر ہے کہ ان صحابہ کرام سے یہ حدیثیں سن کر روایت کرنے والے تابعین کی تعداد اور ان کے بعد سے اب تک ان حدیثوں کو بعد کے لوگوں تک پہنچانے والے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتی ہی چلی گئی ہے' ان میں سے ہر حدیث الگ الگ اگرچہ متواتر نہ ہو مگر ان سب احادیث کا مشترکہ مضمون جو اجماع کی حجیت کو ثابت کرتا ہے متواتر[۱] ہے' لہٰذا تواتر سے اجماع کا حجت ہونا اور فقہ کے لئے عظیم ماخذ ہونا قرآن و سنت کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح ہے۔

یہ سب وہ آیات و احادیث ہیں جن سے اجماع کے حجت ہونے پر فقہاء اور

---

[۱] تواتر کی اس قسم کو "تواتر فی القدر المشترک" کہا جاتا ہے' اور یہ بھی تواتر کی باقی قسموں کی طرح علم قطعی یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ (رفیع)

محدثین و مفسرین نے عام طور پر استدلال کیا ہے، بعض علماء محققین نے اور بھی کئی آیات و احادیث سے استدلال[1] کیا ہے، مگر ہم نے اختصار کے پیشِ نظر صرف وہ آیات و احادیث یہاں ذکر کی ہیں جو اجماع کی حجیت میں زیادہ واضح تھیں، مطالعہ کے دوران اس سلسلہ میں صحابہ کرام کے اقوال و آثار بھی سامنے آئے مثال کے طور پر چند یہ ہیں۔

حجیت اجماع پر چند آثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد[2] ہے کہ :-

مارآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن و مارآہ المسلمون قبیحا فھو عند اللہ قبیح۔

"جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھی اور جس کو تمام مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بری ہے۔"

---

[1] مثلاً سورہ نساء کی آیت "یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (نساء : ۵۸) اور سورہ اعراف کی آیت "وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق و بہ یعدلون" (اعراف : ۱۸۰) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "یوشک ان تعرفوا اھل الجنہ من اھل النار" او قال "خیار کم من شرار کم ، قیل یا رسول اللہ بما ذا ؟ قال بالثناء الحسن و الثناء السیی انتم شھداء بعضکم علی بعض (مستدرک، کتاب العلم، ص ۱۲۰ ج اول قال الحاکم ہذا حدیث صحیح الاسناد وقال الذہبی "صحیح")۔

[2] موطا امام محمدؒ، کتاب الصلوۃ، باب قیام شہر رمضان، ص ۱۴۰ و مجمع الزوائد، ص ۱۷۸ ج اول، بحوالہ احمد و البزار والطبرانی فی الکبیر، وقال رجالہ موثقون، امام محمدؒ نے موطا میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے، مگر سند ذکر نہیں فرمائی، ان تک یہ ارشاد ضرور قابل اعتماد سند سے پہنچا ہوگا، اور ظاہر بھی یہی ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سنا ہوگا، کیونکہ اتنا بڑا قاعدہ کلیہ جو اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسندیدگی کی خبر دے رہا ہو محض قیاس سے دریافت نہیں کیا جاسکتا، یہ بات صرف وحی سے ہی معلوم ہوسکتی ہے، اور صاحب وحی ہی بتلاسکتا ہے، مگر ہم نے اس ارشاد کو احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے آثار صحابہ میں اس لئے شمار کیا ہے کہ جن قابل اعتماد سندوں سے یہ ہم تک پہنچا ہے وہ سب ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جاکر ختم ہو جاتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتیں، بعض سندوں میں یہ ضرور ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بتا کر روایت کیا ہے، مگر وہ سندیں قابل اعتماد نہیں، تفصیل کیلئے دیکھئے "التعلیق الممجد علی موطا الامام محمدؒ" ص ۱۴۰ و ۱۴۱۔

۲۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور قاضی "شریح" کو عدالتی فیصلوں کے لئے جو بنیادی اصول لکھ کر بھیجے ان میں تیسرا اصول یہی تھا کہ جس مسئلہ کا حکم قرآن و سنت میں (صریح طور پر) نہ ملے "اس میں امت کے اجماعی فیصلہ پر عمل کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ سرکاری فرمان امام شعبی" نے ان الفاظ میں نقل[۱] کیا ہے کہ :۔

کتب عمر الی شریح ان اقض بما فی کتاب اللہ، فان اتاک امر لیس فی کتاب اللہ فاقض بما سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فان اتاک امر لیس فی کتاب اللہ ولم یسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانظر لہ الذی اجتمع علیہ الناس، فان جاءک امر لم یتکلم فیہ احد فای الامرین شئت فخذ بہ ان شئت فتقدم و ان شئت فتاخر ولا اری التاخر الا خیر الک۔

"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شریح کو لکھ کر بھیجا کہ تم فیصلے قرآن حکیم کے مطابق کرو" اور اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا (صریح) حکم قرآن شریف میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو' اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم (صریح طور پر) نہ قرآن حکیم میں ہو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تو تم اس کیلئے وہ فیصلہ تلاش کرو جس پر سب لوگ متفق ہو چکے ہوں' اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آجائے جس کے متعلق کسی کا فیصلہ موجود نہ ہو (نہ قرآن میں نہ سنت میں نہ اجماع میں) تو اب دو صورتوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرلو' یعنی چاہو تو آگے بڑھ کر اپنے (اجتہاد سے فیصلہ کر دو) اور چاہو تو پیچھے ہٹ جاؤ (یعنی اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کے بجائے اہل علم سے پوچھ کر عمل کرو) اور میں تمہارے لئے ایسے موقع پر پیچھے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔"

---

[۱] دیکھئے خطیب بغدادی کی مشہور تصنیف "کتاب الفقیہ و المتفقہ ص ۲۰۳ ج ۱ و ۲ ... خاص۔

۳۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد[1] ہے کہ :۔

اتقوا اللہ وعلیکم بالجماعۃ فان اللہ لم یکن لیجمع امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی ضلالۃ۔

"اللہ سے ڈرو اور "الجماعت" کے ساتھ ساتھ رہو" کیونکہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو کبھی بھی کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔"

اجماع کا فائدہ اور "سند اجماع"

یہاں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اجماع کے حجت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجماع کرنے والوں کو شرعی احکام میں نعوذ باللہ خدائی اختیارات مل گئے ہیں، کہ وہ قرآن و سنت سے آزاد ہو کر جس کو چاہیں حرام اور جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں" خوب سمجھ لینا چاہئے کہ فقہ کا کوئی مسئلہ قرآن یا سنت کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا" اجماع کا بھی ہر فیصلہ قرآن و سنت کا محتاج ہے، چنانچہ فقہ کے جس مسئلہ پر بھی اجماع منعقد ہوتا ہے وہ مسئلہ یا تو قرآن حکیم کی کسی آیت سے ماخوذ ہوتا ہے "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے "یا ایسے قیاس سے جس کی اصل قرآن یا سنت میں موجود ہو" غرض ہر اجماعی فیصلہ کسی نہ کسی دلیل شرعی پر مبنی ہوتا ہے، جس کو "سند اجماع" کہا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب ہر اجماعی فیصلہ قرآن یا سنت یا قیاس پر مبنی ہوتا ہے تو اجماع سے کیا فائدہ ہوا؟ اور اسے فقہ کے دلائل میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اجماع کے دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ قرآن یا سنت یا قیاس سے ثابت ہونے والا حکم اگر "ظنی"[2] ہو تو اجماع اسے "قطعی" بنا دیتا ہے، "جس کے بعد کسی فقیہ مجتہد کو بھی اس

---

[1] کتاب الفقہ و المتفقہ، ص ۱۶۷ جزو خامس۔

[2] جو حکم دلیل ظنی سے ثابت ہو وہ ظنی ہوتا ہے، اور جو دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ قطعی ہوتا ہے، دلیل ظنی اور دلیل قطعی کا کچھ بیان پیچھے "نَی" بحث میں ہو چکا ہے۔" یہاں اتنی بات اور سمجھ لی جائے کہ قرآن حکیم کی جن آیات کا مطلب معین طور پر خوب واضح اور یقینی نہ ہو بلکہ اس میں ایک سے زیادہ مطالب کا احتمال ہو تو وہ آیت معنی کے اعتبار سے ظنی ہوتی ہے (اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے ہر آیت قطعی ہے، بلکہ قرآن کریم کا ہر لفظ قطعی طور پر ثابت ہے، لیکن بعض کے معنی بھی قطعی ہوتے ہیں اور بعض کے ظنی) اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی ہوتا ہے، نیز قیاس بھی دلیل ظنی ہے اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی، اجماع ان تمام ظنی احکام کو قطعی بنا دیتا ہے۔

سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اگر وہ حکم پہلے ہی قطعی تھا تو اجماع اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا کر دیتا ہے۔ اور دوسرا فائدہ اجماع کا یہ ہے کہ وہ جس دلیل شرعی پر مبنی ہو بعد کے لوگوں کو اس دلیل کو پرکھنے اور اس میں غور و فکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ان کو اس مسئلہ پر اعتماد کرنے کیلئے بس اتنی دلیل کافی ہوتی ہے کہ فلاں زمانہ کے تمام فقہاء کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، انہوں نے کس دلیل شرعی کی بنیاد پر یہ اجماعی فیصلہ کیا تھا؟ یہ جاننے کی ضرورت بعد کے لوگوں کو نہیں رہتی، سند اجماع کی چند مثالوں سے یہ بات کچھ اور واضح ہو جائیگی :-

چند مثالیں :-

(۱)۔ مثلاً فقہ کا مشہور اجماعی مسئلہ ہے کہ دادی، نانی اور نواسی سے نکاح حرام ہے، اجماع کرنے والوں نے یہ مسئلہ قرآن حکیم کی آیت :-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ (نساء : ۲۳)

""حرام کی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں۔""

سے لیا ہے، لہٰذا یہ آیت اس مسئلہ کے[۱] لئے ""سند اجماع"" ہے، مذکورہ بالا فقہی حکم اگرچہ اس آیت سے ثابت ہو چکا تھا، کیونکہ ""امہات"" (مائیں) کا لفظ دادی اور نانی کو بھی شامل ہے، اور ""بنات"" (بیٹیاں) کا لفظ نواسی کو شامل[۲] ہے، لیکن یہ حکم یقینی اور قطعی نہ تھا، کیونکہ یہ احتمال یہاں موجود تھا کہ امہات (مائیں) سے یہاں صرف حقیقی مائیں مراد ہوں، دادی اور نانی مراد نہ ہوں، اس طرح بنات (بیٹیاں) کے لفظ میں احتمال تھا کہ اس سے یہاں صرف حقیقی بیٹیاں مراد ہوں اور بیٹوں کی بیٹیاں مراد نہ ہوں، چنانچہ اس احتمال کی بنیاد پر کوئی مجتہد یہ کہہ سکتا تھا کہ دادی، نانی اور نواسی سے نکاح حرام نہیں، مگر جب ان کے حرام ہونے پر[۳] اجماع منعقد ہو گیا تو یہ حکم قطعی اور یقینی ہو گیا، اور مذکورہ بالا احتمال معتبر نہ رہا، اور کسی مجتہد کو اس سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

(۲) یہ تو اس اجماعی فیصلہ کی مثال تھی جو قرآن حکیم سے ماخوذ ہے، اور سنت سے ماخوذ ہونے کی مثال[۴] فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ کھانے کی کوئی چیز خرید کر قبضہ کرنے سے پہلے

---

[۱] تسہیل الوصول، ص ۱۷۶۔
[۲] تفسیر روح المعانی، ص ۲۴۹ ج ۴۔
[۳] حوالا بالا۔
[۴] نورالانوار، ص ۲۲۲، مبحث الاجماع۔

فروخت کر دینا جائز نہیں (جیسا کہ آج کل سٹہ میں ہوتا ہے کہ محض زبانی طور پر کسی چیز کی خریداری کا معاملہ کر کے قبضہ کئے بغیر اسے دوسرے کے ہاتھ اور دوسرا تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، جو قطعاً "حرام ہے") اس مسئلہ میں سند اجماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد[1] ہے کہ :-

من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یستوفیه -

"جس نے کوئی کھانے کی چیز خریدی وہ اس پر جب تک قبضہ نہ کرلے اسے فروخت نہ کرے -"

یہ حکم جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس حدیث سے معلوم ہو چکا تھا، مگر یہ حدیث "غیر متواتر" تھی، اور پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ "حدیث غیر متواتر" ظنی ہوتی ہے، لہٰذا یہ حکم بھی ظنی تھا قطعی نہ تھا جب اس پر اجماع منعقد ہو گیا تو یہی حکم قطعی بن گیا۔

(۳) اور قیاس سے ماخوذ ہونے کی مثال[2] فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ ربا (سود) چاول میں بھی جاری ہوتا ہے، یعنی جب چاول کو چاول کے عوض میں فروخت کیا جائے تو ادھار بھی حرام ہے، اور کسی طرف مقدار میں کمی بیشی بھی حرام، لین دین ہاتھوں ہاتھ ہونا ضروری ہے، اور دونوں چاول خواہ مختلف قسموں کے ہوں مگر مقدار ان کی برابر ہونی ضروری ہے، ادھار کریں گے یا مقدار میں کسی ایک طرف کمی بیشی کریں گے تو ربا ہو جائے گا، جو حرام ہے۔

یہ اجماعی فیصلہ قیاس کی بنیاد پر کیا گیا ہے، یعنی اس مسئلہ میں "سند اجماع" قیاس ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں ------ سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور، نمک ------ کے بارے میں فرمایا[3] تھا کہ ان میں سے کسی چیز کو جب تم اسی کی جنس کے بدلے میں فروخت کرو تو اس میں ادھار یا کمی بیشی ربا ہے، جو حرام ہے، حدیث سے ان چھ چیزوں کا حکم تو صاف طور پر معلوم ہو گیا تھا، مگر چاول کے متعلق یہ حدیث خاموش تھی، اجماع کرنے والوں نے چاول کا حکم ان چھ چیزوں پر قیاس[4] کر کے معلوم کیا اور بتایا کہ جو حکم ان چھ چیزوں کا ہے وہی چاول کا بھی ہے۔

---

[1] مشکوۃ شریف عن ابن عمرؓ ص ۲۴۷ ج ۱ کتاب البیوع، باب المنہی عنہا من البیوع، بحوالہ بخاری و مسلم۔
[2] نورالانوار، ص ۲۲۲، مبحث الاجماع۔
[3] صحیح مسلم شریف، ص ۲۴ و ۲۵ ج ۲، باب الربا کتاب البیوع۔
[4] قیاس ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ فکری عمل ہے، جس کی بہت سی شرائط ہیں، قیاس کی حقیقت انشاء اللہ آگے اپنے مقام پر بیان ہوگی۔

اگر اس قیاس پر سب مجتہدین کا اجماع نہ ہوا ہوتا تو یہ حکم ظنی ہوتا' کیونکہ قیاس دلیل ظنی ہے' اور دلیل ظنی سے حکم قطعی ثابت نہیں ہو سکتا' مگر جب اس قیاس پر ایک زمانے کے تمام فقہاء نے اجماع کر لیا تو یہ حکم قطعی ہو گیا' اجماع سے پہلے کسی فقیہ کو اس سے مختلف قیاس کرنے کی گنجائش تھی' اجماع کے بعد یہ گنجائش ختم ہو گئی۔

(۴) بسا اوقات جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہوا ہو وہ پہلے ہی سے قطعی ہوتا ہے' ایسی صورت میں اجماع سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی قطعیت میں مزید تاکید اور قوت پیدا ہو جاتی ہے' مثلاً پانچوں فرض نمازوں میں رکعتوں کی تعداد سنت متواترہ سے ثابت ہے' اور اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر قطعی طور پر فرض ہے' پھر پوری امت کا اجماع بھی اس پر چلا آرہا ہے' جس کیلئے "سند اجماع" یہی سنت متواترہ ہے' اس مثال میں ایک ایسے حکم شرعی پر اجماع منعقد ہوا ہے جو پہلے ہی سے قطعی تھی' لہٰذا اجماع سے اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا ہوگئی ہے' اب اگر کسی زمانہ میں لوگوں کو خدانخواستہ یہ معلوم نہ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں نمازوں میں اس تعداد کی خود بھی پابندی فرمائی تھی اور سب کو اس کی پابندی کا حکم دیا تھا تب بھی لوگوں کو اس کی پابندی اس لئے لازم ہوگی کہ پوری امت کا اجماع اس پر چلا آرہا ہے' یہی حال اوپر کی باقی مثالوں کا ہے' کہ اجماع کرنے والوں نے جس سند اجماع کی بنیاد پر وہ فیصلے کئے تھے اگر بعد کے لوگوں کو وہ سند اجماع معلوم نہ ہو یا یاد نہ رہے' تب بھی وہ اجماعی فیصلے قطعی اور واجب العمل رہیں گے' کیونکہ سند اجماع کی ضرورت اجماع کرنے والوں کو ہوتی ہے' بعد کے لوگوں کو (خواہ وہ فقہاء اور مجتہد ہوں) سند اجماع کی ضرورت نہیں' ان کیلئے صرف اجماع ہی کافی دلیل ہے۔

اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے؟

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اجماع صرف عاقل' بالغ مسلمانوں کا معتبر ہے' کسی مجنون' بچہ یا کافر کی موافقت و مخالفت کا اعتبار نہیں' نیز اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اجماع منعقد ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ عہد صحابہ سے لے کر قیامت تک کے تمام مسلمان کسی مسئلہ پر متفق ہوں' اس لئے کہ اگر اسے اجماع کیلئے شرط قرار دیا جائے تو قیامت سے پہلے کسی بھی مسئلے پر اجماع منعقد نہ ہو سکے گا' لہٰذا اس میں کوئی اختلاف نہیں

کہ اجماع کیلئے کسی ایک زمانہ کے مسلمانوں کا متفق ہو جانا کافی[1] ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ضروری ہے یا مخصوص قسم کے افراد کا متفق ہو جانا کافی ہے؟ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں ہم یہاں چند اقوال ذکر کرتے ہیں۔

(۱)--- امام مالک ؒ[2] کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع معتبر ہے، کسی اور کی موافقت یا مخالفت کا اعتبار نہیں۔

(۲)--- فرقہ زیدیہ اور امامیہ[3] صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو اجماع کا اہل کہتا ہے دوسرے لوگوں کا اجماع ان کے نزدیک معتبر نہیں۔

(۳)--- بعض حضرات[4] کے نزدیک صرف صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے، ان حضرات کے نزدیک اجماع کا دروازہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

(۴)--- بعض حضرات[5] کہتے ہیں کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق اجماع کیلئے شرط ہے، عوام ہوں یا خواص، عالم ہوں یا جاہل، جب تک سب متفق نہ ہوں اجماع منعقد نہ ہو گا۔

(۵)--- پانچواں قول جمہور[6] کا ہے جو نہایت معتدل ہے، وہ یہ کہ اجماع صحابہ کے ساتھ خاص نہیں، کسی بھی زمانہ کے تمام متبع سنت فقہاء (مجتہدین) کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا اجماع کے لئے کافی ہے، عوام اور اہل بدعت اور فاسق کی موافقت و

---

[1] الاحکام للآمدی" ص ۱۱۵ جلد اول۔

[2] مشہور یہی ہے مگر بہت سے علماء نے امام مالک ؒ کی طرف اس مذہب کی نسبت کا انکار کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے "التقریر و التحبیر ص ۱۰۰ ج ۳۔

[3] التقریر و التحبیر شرح التحریر، ص ۹۸ ج ۳۔

[4] مثلاً داؤد اصفہانی (تسہیل الوصول ص ۱۷۰) ابن حبان کے کلام سے بھی اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے، امام احمد ؒ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ اجماع صحابہ کے ساتھ خاص ہے، اور دوسرا یہ کہ خاص نہیں، دوسرے قول کو علماء حنابلہ نے صحیح اور راجح قرار دیا ہے، (التقریر، ص ۹۷ ج ۳)۔

[5] قاضی ابوبکر باقلانی اور علامہ آمدی کا رجحان اسی طرف ہے، مگر دونوں کی رائے میں یہ فرق ہے کہ قاضی ابوبکر تو فرماتے ہیں کہ جس اجماع میں کسی عام مسلمان کا اختلاف ہو وہ اجماع شرعاً حجت تو ہے مگر اس اجماع کو "اجماع امت" نہیں کہا جائے گا، کیونکہ عام مسلمان بھی امت کا فرد ہے، اور علامہ آمدی ایسے اجماع کو حجت بھی نہیں مانتے، دیکھئے التقریر شرح التحریر، ص ۸۰ ج ۳۔

[6] التقریر شرح التحریر، ص ۸۱ و ۹۵ و ۹۷ ج ۳۔

مخالفت کا اعتبار نہیں۔

قرآن وسنت کے جن دلائل سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوا ہے' ان سے بھی اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے' اس لئے کہ آیات واحادیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کہیں بھی اجماع کو کسی خاص زمانہ یا خاص مقام یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا' بلکہ مطلقاً "المومنین" "الامة" "الجماعة" یا "سواد اعظم" کے اتفاق کو حجت قرار دیا گیا ہے' اور یہ چاروں الفاظ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ' آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی صادق آتے ہیں' لہٰذا اجماع کو صرف صحابہ کرام یا اہل بیت یا اہل مدینہ کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی واضح دلیل قرآن وسنت میں نہیں ملتی۔

اجماع کو صرف صحابہ کرام کے ساتھ خاص کرنے والے حضرات جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے' مگر یہ کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ بعد کے فقہاء کا اجماع حجت نہیں۔

جاہل' فاسق اور اہل بدعت کے اختلاف سے اجماع باطل نہیں ہوتا

رہا یہ سوال کہ جب مومنین' امت' الجماعة اور سواد اعظم کے اجماع کو قرآن وسنت میں حجت قرار دیا گیا ہے تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ عام مسلمانوں بلکہ اہل بدعت اور فاسق وفاجر مسلمانوں کی موافقت بھی اجماع کیلئے شرط ہو اور ان کے اختلاف کی صورت میں اجماع منعقد نہ ہو' کیونکہ مومنین اور امت میں یہ لوگ بھی داخل ہیں۔

جواب یہ ہے کہ جن دلائل سے اجماع کی حجیت ثابت ہوئی ہے ان میں اور دیگر آیات واحادیث میں اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اجماع صرف متبع سنت فقہاء کرام ہی کا معتبر ہے' باقی لوگوں کی موافقت یا مخالفت سے اجماع پر اثر نہیں پڑتا' ان دلائل کی کچھ تفصیل یہ ہے :-

۱) قرآن حکیم میں دو جگہ صریح ارشاد ہے کہ :-

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (نحل - ۴۳ و انبیاء - ۷)

(انبیاء-۷)

"اگر تم نہیں جانتے تو اہل[۱] علم سے دریافت کرو"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں ان پر واجب ہے کہ علماء سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کریں[۲]، تو جب عوام کو خود علماء کے فتوی کا پابند کیا گیا ہے تو دنیا بھر کے تمام علماء فقہاء کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت عوام کو کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور ان کے موافقت نہ کرنے سے فقہاء کا اجماع کیسے باطل ہو سکتا ہے!

(۲) قران حکیم نے فاسق کی دی ہوئی خبر کے متعلق یہ قانون ارشاد فرمایا ہے کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَائَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ (الحجرات، ٦)

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے و (اس خبر کی) خوب تحقیق کر لیا کرو، کبھی کسی قوم کی نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔"

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت مقبول نہیں، تو جب عارضی نوعیت کے واقعات میں فاسق کی خبر اور شہادت کا یہ حال ہے تو دینی مسائل جو قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے حجت اور واجب الاتباع بننے والے ہوں، ان میں اس کی شخصی رائے کیسے معتبر ہو سکتی ہے؟ اور جو بدعت فسق کی حد تک پہنچی ہوئی ہو اس کا مرتکب بھی فاسق ہے، لہٰذا ایسے اہل بدعت کی رائے بھی اجماع میں معتبر نہیں، اسی لئے جمہور علماء اہل سنت والجماعت نے شیعہ، خوارج اور معتزلہ وغیرہ کے اختلاف کا اجماع میں اعتبار نہیں کیا۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ اجماع میں عوام کی موافقت و مخالفت معتبر نہیں،

---

[۱] یہ اہل الذکر ہی کا ترجمہ ہے، لفظ "الذکر" کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، ان میں سے ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں توراۃ کو بھی "الذکر" فرمایا ہے، ارشاد ہے "ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر" اور خود قرآن کریم نے بھی اپنا ایک نام "الذکر" بتایا ہے جیسا کہ سورہ نحل کی آیت (۴۴) وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم" میں "الذکر" سے مراد قرآن کریم ہے، اس لئے "اہل الذکر" کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے، (تفسیر معارف القرآن، ص ۳۳۲، ج ۵)۔

[۲] تفسیر قرطبی، ص ۲۷۲ ج ۱۱ و تفسیر معارف القرآن، ص ۱۵۹ ج ۶ و ص ۳۳۳ ج ۵۔

اور اس دوسری آیت سے ثابت ہوا کہ فاسق اور اہل بدعت کی موافقت و مخالفت کا اعتبار نہیں، اس لئے حاصل ان دونوں آیتوں کا وہی ہے جو جمہور علماء نے اختیار کیا کہ اجماع صرف متبع سنت فقہاء کا معتبر ہے، اور یہی بات ان احادیث سے ثابت ہوتی ہے۔جن سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم وہ احادیث خاصی تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں، یہاں ہمیں ان کے الفاظ کا مختصر جائزہ لینا ہو گا، جس سے جمہور کا مسلک بخوبی واضح ہو سکے گا۔

(۱) سب سے پہلی حدیث جو ہم نے اجماع کی حجیت پر پیش کی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم قرآن و سنت میں نہ ملے تو اس میں آپ ﷺ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ :۔

شاوروا فیه الفقهاء و العابدین۔

"تم اس معاملہ میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو۔"

اس حدیث میں صراحت ہے کہ جو لوگ فقہاء بھی ہوں اور عابدین بھی صرف انہی کا مشورہ واجب الاتباع ہو گا۔

(۲) دوسری حدیث میں جو گیارہ صحابہ کرام نے روایت کی ہے اس میں پوری امت کا لفظ نہیں بلکہ "طائفة من امتی" کا لفظ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "میری امت میں ایک جماعت حق پر قائم اور اس کے لئے برسرپیکار ہوگی" اس میں پوری امت کے ہر فرد کے حق پر قائم رہنے کی خبر نہیں دیگئی بلکہ بتایا گیا ہے کہ امت میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، جو مخالفین سے حق کے لئے برسرپیکار رہے گی، اب خود اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتباع حق پر قائم رہنے والی جماعت کا لازم ہو گا، یا اس کے مخالفین کا؟

(۳) تیسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو یہ ارشاد ہے کہ :۔

لن یزال امر هذه الامة مستقیما حتی تقوم الساعة۔

"اس امت کی حالت قیامت تک سیدھی رہے گی۔"

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ اس امت کا ہر فرد نیکو کار اور ہدایت یافتہ رہیگا کوئی بھی شخص غلطی نہیں کرے گا کیونکہ مشاہدہ بھی اس کے خلاف ہے، اور اوپر کی اور بعد میں آنے والی حدیثیں بھی، لہٰذا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس امت کا پورا مجموعہ باطل اور غلط بات پر متفق نہیں ہو گا، کچھ لوگ حق پر ضرور قائم رہیں گے، باقی جو لوگ ان کی مخالفت کریں گے کیا کریں، یہ حق پر ڈٹے رہیں گے،

جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ امت بحیثیت مجموعی گمراہی سے محفوظ رہے گی' اور یہ وہی بات ہے جو اوپر کی حدیث میں آچکی ہے' اب خود فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ حق پر ڈٹے رہیں گے اتباع ان کا واجب ہو گا یا ان کے مخالفین کا؟

(۴) چوتھی حدیث میں جو آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ :-

ان الله لایجمع امتی (اوقال امة محمد) علی ضلالة وید الله علی الجماعة ومن شذ شذ الی النار۔

"اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کریگا اور اللہ کا ہاتھ "الجماعة" پر ہے' اور جو الگ راستہ اختیار کریگا جہنم کی طرف جائے گا۔

اس حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ وہ بات آگئی ہے جو ہم اوپر تیسری حدیث کے ضمن میں کہہ آئے ہیں کہ "امت کی حالت ہمیشہ سیدھی رہنے" اور "کسی گمراہی پر متفق نہ ہونے کا" یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بھی کجروی یا گمراہی کا شکار نہ ہو گا' ہر فاسق و فاجر اور بدعتی مسلمان جو مشورہ بھی دینی امور میں پیش کرے گا صحیح اور درست ہو گا' بلکہ اس حدیث کے آخری دو جملوں "اللہ کا ہاتھ الجماعة پر ہے" اور جو "الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا" نے بتا دیا کہ امت کی حالت سیدھی رہنے اور گمراہی پر متفق نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے گی جو راہ ہدایت پر قائم رہے گی جس کے نتیجہ میں امت بحیثیت مجموعی گمراہ ہو جانے سے محفوظ رہے گی' اس جماعت کو اللہ کی طرف سے خاص ہدایت و نصرت ملتی رہے گی' لوگوں پر لازم ہو گا کہ اس جماعت کی پیروی کریں' اور جو ان سے الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

معلوم ہوا کہ اجماع صرف اسی جماعت کا حجت ہو گا' دوسروں کی موافقت پر موقوف اور دوسروں کی مخالفت سے باطل نہ ہو گا۔

(۵ تا ۸) حدیث نمبر (۵) سے نمبر (۸) تک ۴ حدیثیں جو مجموعی طور پر ۳۴ صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہیں ان میں "الجماعة" کی پیروی کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے' اور اس کی مخالفت پر ہولناک سزائیں بیان ہوئی ہیں۔

نویں (۹) حدیث میں "سواد اعظم" کی پیروی کا حکم ہے' اور وہیں ہم نے دوسری حدیثوں کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ "الجماعة" اور "سواد اعظم" درحقیقت ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں' اور یہ دونوں نام ان مسلمانوں کے ساتھ

مخصوص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے پیرو ہوں' اسی بناء پر ان کو "اہل السنة و الجماعة" بھی کہا جاتا ہے۔

اور دسویں (۱۰) حدیث میں تو صراحت ہے کہ اس امت میں' تہتر فرقے ہوں گے' جن میں سے نجات یافتہ فرقہ صرف ان لوگوں کا ہے جو متبع سنت ہوں' باقی سب فرقے گمراہ ہیں۔

پس حدیث نمبر ۵ سے نمبر ۱۰ تک سب حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیروی صرف ان لوگوں کی لازم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت کے پیرو ہوں' اور ان کے مخالفین گمراہ اور سخت عذاب کے مستحق ہیں' اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اجماع صرف متبع سنت مسلمانوں کا کافی ہوگا یا فاسق اور اہل بدعت کی مخالف کی وجہ سے اسے باطل کر دیا جائیگا؟

حاصل کلام یہ کہ جمہور فقہاء نے جو مسلک اختیار کیا ہے کہ اجماع میں عوام' اہل بدعت اور فاسق مسلمانوں کا اختلاف یا اتفاق معتبر نہیں' بلکہ صرف متبع سنت فقہاء کا اجماع ہی حجت ہے' قرآن و سنت کی تصریحات سے اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے' اور حنفیہ [۱] نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اجماع کی قسمیں :-

بنیادی طور پر اجماع کی تین قسمیں ہیں (۱) اجماع قولی (۲) اجماع عملی' (۳) اجماع سکوتی' ان تینوں کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) اجماع قولی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات زبانی طور پر کسی دینی مسئلہ پر اپنا اتفاق ظاہر کریں' جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی' اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔

(۲) اجماع عملی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات کسی زمانہ میں کوئی عمل کریں' جب کوئی عمل تمام اہل اجماع (جائز یا مستحب یا مسنون سمجھ کر) کرنے لگیں تو اس عمل کو بالا جماع جائز سمجھا جائے گا' اجماع کی اس قسم سے اس فعل کا صرف مباح یا مستحب یا مسنون ہونا ثابت ہو گا' واجب ہونا اس قسم سے ثابت نہیں ہو سکتا' الا یہ کہ وہاں کوئی قرینہ ایسا پایا جائے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہو۔

ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں جو سنت موکدہ ہیں ان کا سنت موکدہ ہونا صحابہ

---

[۱] التقریر' ص ۹۵ و ۹۶ ج ۳۔

کرامؓ کے اجماع عملی سے ثابت ہوا ہے۔

۳۔ اجماع سکوتی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والوں میں سے کچھ حضرات کوئی متفقہ فیصلہ زبانی یا عملی طور پر کریں جس کی اس زمانہ میں خوب شہرت ہو جائے، یہاں تک کہ باقی سب مجتہدین کو بھی اس فیصلہ کی خبر ہو جائے، مگر وہ غور و فکر اور اظہار رائے کا موقع ملنے کے باوجود سکوت اختیار کریں ان میں سے کوئی بھی اس فیصلہ سے اختلاف نہ کرے۔

اجماع کی ان تینوں قسموں میں سے پہلی دونوں قسمیں تو سب فقہاء کے نزدیک حجت ہیں، البتہ تیسری قسم یعنی "اجماع سکوتی" کے حجت ہونے میں فقہاء کا اختلاف[1] ہے، امام احمد، اکثر حنفیہ اور بعض شوافع کے نزدیک یہ حجت قطعیہ ہے، اور امام شافعیؒ اکثر شوافع اور اکثر مالکیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں، اور بعض فقہاء نے اسے "حجت ظنیہ" قرار دیا ہے۔[2]

یہ اجماع کی قسموں کا اجمالی بیان ہے، تفصیل کیلئے اصول فقہ کی کتابوں کی مراجعت فرمائی جائے۔

اجماع کے مراتب :-

اجماع کرنے والوں کے اعتبار سے اجماع کے حسب ذیل تین درجات ہیں :-

۱۔ سب سے قوی درجہ کا اجماع وہ ہے جو تمام صحابہ کرام نے عملی یا زبانی طور پر صراحتاً کیا ہو، اس لئے کہ اس کے حجت قطعیہ ہونے پر پوری[3] امت کا اتفاق ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ صحابہ کرام کے "اجماع سکوتی" کا ہے، یہ بھی اگرچہ حنفیہ سمیت بہت سے فقہاء کے نزدیک حجت قطعیہ ہے، مگر اس کا منکر کافر نہیں، کیونکہ اس کے حجت ہونے میں امام شافعیؒ اور بعض دیگر فقہاء کا اختلاف ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا۔

۳۔ تیسرے درجہ پر وہ اجماع ہے جو صحابہ کرامؓ کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء نے کیا ہو، یہ بھی جمہور کے نزدیک حجت تو ہے، مگر "حجت قطعیہ" نہیں، کیونکہ جو حضرات غیر صحابہ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے، ان کے اختلاف کی وجہ سے اس اجماع میں

---

[1] یہاں تک ان تین قسموں کا بیان تسہیل الوصول، ص ۱۶۸ و ص ۱۷۲ سے ماخوذ ہے۔
[2] التقریر، ص ۱۰۱ و ۱۰۲ ج ۳۔
[3] جو حضرات صرف اہل مدینہ یا صرف اہل بیت کے اتفاق کو اجماع کے لئے کافی سمجھتے ہیں تمام صحابہ کا اجماع ان کے نزدیک بھی حجت قطعیہ ہے، کیونکہ صحابہ میں اس زمانے کے اہل مدینہ اور اہل بیت بھی داخل ہیں۔ (تسہیل الوصول، ص ۱۷۲)۔

قطعیت باقی نہیں رہی، یہ درجہ میں "سنت مشہورہ" کے مانند ہے، اس کا منکر بھی کافر نہیں۔

ان سب درجات کی تفصیل کیلئے اصول فقہ کی کتابوں[1] کا مطالعہ کیا جائے

نقل اجماع :۔

اجماعی فیصلوں کے درجات کی جو ترتیب اوپر بیان ہوئی وہ اصل کے اعتبار سے ہے، لیکن جب اجماعی فیصلے کی خبر ہم تک پہنچے گی تو اس خبر کی روایت جتنی قوی ہوگی، ہمارے حق میں اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی اتنی ہی قوی ہوگی، اور روایت میں جس قدر ضعف ہوگا اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی ہمارے حق میں اتنی ہی ضعیف ہوجائے گی، چنانچہ تمام صحابہ کرام کا اجماع قولی یا عملی جو درجہ اول کا اجماع ہے اور اپنی ذات میں "حجت قطعیہ" ہے، اگر اس کی خبر ہم تک "تواتر" سے پہنچے تب تو وہ ہمارے لئے بھی حجت قطعیہ باقی رہے گا، اور اس کا منکر کافر ہوگا، لیکن اس کی خبر ہم تک اگر قابل اعتماد سند سے تواتر کے بغیر پہنچے تو اس کی قطعیت ہمارے حق میں ختم ہوجائے گی، اور اس کا حکم وہی ہوگا جو غیر متواتر حدیث کا ہوتا ہے، کہ وہ "دلیل ظنی" ہوتی ہے، شرعی احکام اس سے ثابت ہوسکتے ہیں مگر اس کا منکر کافر نہیں[2] ہوتا۔

اور اگر اس کی خبر سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہو تو اس کا حکم وہ ہوگا جو "حدیث ضعیف" کا ہوتا ہے، کہ وہ حجت ہی نہیں، اور اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہ کا ماخذ ہونے کے اعتبار سے درجہ اول کے اجماع کی حیثیت ہمارے لئے وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ اگر وہ ہم تک تواتر سے پہنچے تو "دلیل قطعی" ہے، اور سند ضعیف سے پہنچے تو وہ ہمارے لئے کسی شرعی حکم کی دلیل نہیں بن سکتا۔

---

[1] مثلاً تسہیل الوصول، ص ۱۷۳ اور ۱۷۴، اور التقریر و التحبیر، ص ۸۰ تا ۹۲۔
[2] تسہیل الوصول، ص ۱۴۳۔

تصانیف

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

- آسان نیکیاں
- اندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاستِ حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاحِ معاشرہ
- اصلاحی خطبات (۴ جلد)
- احکامِ اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت و تجارت
- اکابر دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک (۳ جلد)
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہانِ دیدہ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیت حدیث
- حضورؐ نے فرمایا (انتخاب حدیث)
- حکیم الامت کے سیاسی افکار
- درسِ ترمذی (۳ جلد)
- دینی مدارس کا نصاب و نظام
- ضبطِ ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علوم القرآن
- عدالتی فیصلے (شرعی عدالت عظمیٰ کے فیصلے)
- فرد کی اصلاح
- فقہی مقالات
- مآثر حضرت عارفی
- میرے والد۔ میرے شیخ
- ملکیت زمین اور اُس کی تحدید
- مُطابق سُنّت نماز بخوانید
- نقوشِ رفتگاں
- نفاذِ شریعت اور اُس کے مسائل
- نمازیں سُنّت کے مُطابق پڑھیئے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام

تكملة فتح الملهم شرح صحیح مسلم (۶ جلد) — (عربی)
ماهي النصرانيه؟ — (عربی)
نظرة عابرة حول التعليم الإسلامي (عربی)
احكام الأوراق النقدية (عربی)
بحوث في قضايا فقهية معاصرة (عربی)

The Authority of Sunnah.
The Rules of I' tikaf.
What is Chiristianity?
Easy Good Deeds.
Perform Salah Correctly.

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴